تعلیم کا مسئلہ اور اسکا حل

ڈاکٹر برہان الدین فاروقی

تخلیق پاکستان کے بعد پاکستان کو اسلامی بنیادوں پر مستحکم نہ کیا جاسکا۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ جن موثرات نے اس راہ میں رکاوٹ پیدا کی، ان کا نہ تو تعین کیا جاسکا نہ تدارک۔ ان موثرات کا تدارک نہ کرسکنے کا سبب ہمیں اپنی تاریخ کے اب سے بہت پہلے کے دور میں تلاش کرنا چاہیے۔ یہ واقعہ خاص توجہ کا مستحق ہے کہ برعظیم پاک و ہند میں حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی رحمتہ اللہ تعالیٰ علیہ کے مرتبے کا مصلح پیدا ہوا، پھر بھی ملک کو استعماری غلبے کا شکار ہونے سے نہ بچایا جاسکا۔

یہ واقعہ چار موثرات کا نتیجہ ہے: ایک یہ کہ تکمیل دین کا تصور مسخ ہو گیا تھا اور انسان کامل چند مابعد الطبعی عقائد، چند اخلاقی اسباق، چند تمدنی ضوابط، چند اخلاقی اصولوں، چند عدالتی قوانین اور چند رسوم وظواہر میں قید ہو کر رہ گیا تھا۔ تصور دین کے مسخ ہو جانے کا سبب یہ تھا کہ معیاری دین اور معمول بہ دین میں امتیاز کا شعور زائل ہو گیا تھا۔ نتیجہ یہ تھا کہ جو اصطلاحات حضرت مجدد نے تجویز فرما کر جہانگیر سے نافذ کرائیں، ان کے نفاذ کے بعد اس دور کے علماء نے محسوس کیا کہ اب کچھ کرنے کو باقی نہیں رہا؛ حالانکہ ان اصطلاحات سے اس ملک میں اسلام کی صرف وہ حیثیت بحال ہوئی تھی جو دین الٰہی اکبر شاہی سے پہلے اسلام کو حاصل تھی۔

دوسرے یہ کہ ہم زوال پذیر مطلق العنانی کا بدل سیاست میں اور زوال پذیر

جاگیرداری نظام کا بدل معیشت میں تلاش نہ کر سکے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہم دیر تک اپنی سیاسی آزادی کو برقرار نہ رکھ سکے۔ اور معاشی انقلاب کی قیادت ہمارے ہاتھ سے چھن گئی۔

تیسرے یہ کہ ہم زندگی کی وحدت اور اخلاق و معیشت کے ربط کے شعور سے محروم ہو گئے۔ جب استعماری نظام کو غلبہ ہو گیا تو پوری برطانوی حکومت کے وسائل یہ باور کرانے کے لئے استعمال کئے جاتے رہے کہ اسلام قابل عمل نہیں ہے۔

چوتھے یہ کہ زندگی لادینی نظام کے تابع ہو گئی۔ معاشرہ یوں لادینی ہو گیا کہ پہلے معاشرے میں وحدت کے شعور کی اساس فتاوائے عالمگیری کے حوالے سے حنفی نظام فقہ تھا۔ شرعی عدالتوں کے ختم ہو جانے سے اور برطانوی اقتدار کی سعی سے عمرانی وحدت کے شعور کی بنیاد جغرافیائی وفاداری بن گئی۔ معیشت میں لادینی انداز یوں پیدا ہوا کہ ہمارا جاگیرداری کا حامل معاشرہ اپنائے حقوق کے اصرار پر قائم تھا۔ جب قوم پرستوں کی جاگیریں ضبط کر لی گئیں اور غیر ملکی اقتدار نے اپنے وفادار پیدا کرنے کے لیے غداروں کو جاگیروں کا حق ملکیت دے کر نیا جاگیری نظام نافذ کیا تو جاگیردار عوام کے حقوق کی ذمہ داری کے شعور سے آزاد ہو گیا اور صرف اپنے اپنے حقوق کے مطالبے اور نگہداشت کی فضا پیدا ہو گئی۔ نظام تعلیم لادینی ہو گیا۔ نصاب میں مذہب کا کوئی شائبہ باقی نہ رہا۔ مذہب انفرادی، نجی، شخصی، باطنی پہلو سے وابستہ ہو کر رہ گیا۔ اب چونکہ زندگی پر عقائد کا کوئی اثر نہ رہا، اس لئے عقائد، اوہام باطلہ بن گئے اور عبادات، رسوم وظواہر ہو کر رہ گئیں۔

ہر چند کہ اپنے احیاء کی ہر تحریک میں ہم نے جان کی بازی لگائی اور نعرہ ہائے مستانہ بلند کئے مگر سب تحریکیں شعلہ مستعجل ثابت ہوئیں۔ اس کا سبب یہ تھا کہ ہماری فکری بنیادیں کھوکھلی ہو چکی تھیں۔

موجودہ نظام تعلیم غیر ملکی اقتدار کا ترکہ ہے:

جس نظام نے ہمارے عمرانی ثقافتی اختلال کو مکمل کیا، اس کا اندازہ اس کے مصنف ہی کی زبان سے زیادہ صحیح ہو سکے گا۔

سر چارلس ٹریویلین (Sir Charles Trevelyan)، لارڈ میکالے کا رشتہ

دار تھا۔ وہ ایسٹ انڈیا کمپنی میں ایک کلرک کی حیثیت سے ملازم ہوا تھا۔ اور بعد میں صرف ذاتی قابلیت کی بناء پر ترقی کرتے کرتے مدراس کا گورنر ہو گیا۔ اس نے ایجوکیشن اکوائری کمیٹی کے کنوینر کی حیثیت سے ۱۸۳۸ء میں Education of Indian People کے نام سے ایک رپورٹ پیش کی۔ اس رپورٹ کے باب ہفتم کا عنوان ہے "ہندوستانی نظام تعلیم کے سیاسی رجحانات"۔ اس نے جو کچھ اس عنوان کے تحت لکھا ہے، اس کا اقتباس خود اس کے اپنے الفاظ میں یہ ہے:

"مسلمانوں کا نظام تعلیم طاقت، فخر ومباہات اور جوش عزائم پر مبنی ہے۔ اقتدار کی ہوس اور لذائذ جسمانی مذہب کی تائید میں لائے جاتے ہیں۔ کرہ ارض مومنین کی میراث ہے۔ ان کے علاوہ سب کافر اور غاصب ہیں جن سے بجز سیاسی مقتضیات کے کوئی روابط نہیں رکھے جاسکتے۔ تمام ملک باختیار خداوندی مسلمانوں کی ملک ہے۔۔۔ ہندوؤں کا نظام تعلیم اگرچہ کم خوفناک اور متشددانہ نہیں بلکہ اس سے زیادہ مانع اور محدود ہے۔ اس کی رو سے تمام غیر ہندو برادری سے خارج ہیں اور صرف ارذل ترین کاموں کے لائق ہیں اور کسی طرح حکومت کے ان کاموں کے لائق نہیں جو برہموں کی ہدایت میں فوجیوں کے لئے مخصوص ہیں۔

"عربی اور سنسکرت نظام ہائے تعلیم کے یہ میلانات ہیں جو ہماری خوش بختی سے اپنی پوری قوت کے ساتھ بہت مشکل زبانوں میں لکھی ہوئی کتابوں اور چند علماء کے ذہنوں میں بند ہیں جو شاذ و نادر ہی نہایت مضمحل انداز میں لوگوں کے جذبات میں جھلکتے ہیں، لیکن اس نظام تعلیم کے بارے میں کیا کہا جائے گا جو ان کو دوبارہ زندہ کردے، تازہ کردے اور مسلمانوں کو مستقل طور پر یاد دلاتا رہے کہ وہ کافر ہم (انگریز) ہی ہیں جنہوں نے مومنوں کو ان کی بہترین سلطنت سے محروم کیا ہے اور ہندوؤں کو یہ احساس دلاتا رہے کہ ہم ہی وہ نجس درندے ہیں جن سے کسی قسم کے دوستانہ روابط رکھنا گناہ اور شرم کی بات ہے۔ ہمارے بدترین دشمن اس سے زیادہ خواہش نہ کرسکتے تھے کہ ہم ایسے نظام ہائے تعلیم کو پھیلائیں جو خود ہمارے ہی خلاف فطرت انسانی کے شدید ترین جذبات کو مشتعل کردیں۔

"جب تک دیسی لوگ اپنی گذشتہ آزادی پر کڑھتے رہیں گے، اپنے احوال کو بہتر

بنانے کے لئے ان کی ایک ہی تدبیر ہوگی کہ وہ اس ملک سے انگریزوں کو بتمام وکمال جبراً نکال دیں۔ ان کے اعلیٰ اور ادنیٰ، دولتمند اور مفلس اپنے حالات کو بہتر بنانے کا ایک ہی تصور رکھتے تھے۔ اعلیٰ طبقہ اس امید پر زندگی بسر کرتا تھا کہ ان کے ملکی اقتدار کے دوبارہ قیام پر دولت و امتیاز کی راہیں ان پر پھر کھل جائیں گی، حتیٰ کہ زیادہ باشعور اور نسبتاً بہتر اثر قبول کرنے والے دیسی بھی اس بات کا کوئی تصور نہ رکھتے تھے کہ ان کی اس بدحالی کو رفع کرنے کا، انگریزوں کو جبراً پوری طرح سے نکال دینے کے سوا کوئی اور طریقہ بھی ہوسکتا ہے۔

"صرف یورپی تصورات سے ان کو گرما کر ہی یہ ممکن ہے کہ ان کے قومی نظریات کو ایک نیا رخ دیا جاسکے۔ جن نوجوانوں کی تربیت ہمارے تعلیمی مرکزوں میں ہوئی ہے وہ نہایت تحقیر کے ساتھ مطلق العنانی کی اس بربریت کو پھر کر دیکھتے ہیں جس کے تحت ان کے اسلاف کراہتے رہے تھے اور انگریزی طرز کے ان قومی اداروں کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں، اور ہمیں ناپسند کرنے کے بجائے ہمارے ساتھ رہنے کو پسند کرتے ہیں اور ہمیں اپنا فطری محافظ سمجھتے ہیں۔ ان کی سب سے بڑی آرزو ہمارے مشابہ ہو جانا ہے اور ہماری رہنمائی میں اپنے ہم وطنوں کے کردار کو بلند کرنے اور بتدریج ایک پرلطف اور منظم اور اس لئے ایک محفوظ اور پرمسرت آزادی کے حصول کی توقع رکھتے ہیں، اور ہم انگریزوں کو غیر سمجھنے اور ہمارے گلے کاٹنے کے بجائے وہ اس بات کی امنگ رکھتے ہیں کہ ہمارے ساتھ عدالت عالیہ یا مجسٹریٹوں کی کرسی پر بیٹھ کر فیصلے کریں اور پنجاب یا نیپال کی سیاست پر سوچنے کے بجائے وہ اپنی مجالس مذاکرہ میں جو انہوں نے آپس میں قائم کرلی ہیں مطبع کے فوائد اور آزادی گفتار پر خطیبانہ انگریزی تقریروں میں مباحثے کرتے رہیں۔

"انگریزی ادب کی روح، انگریزوں سے روابط پیدا کرنے میں انتہائی موافق اثرات پیدا کرنے کے سوا اور کچھ نہیں ہوسکتی۔ ہمارے ادب کے ذریعے ہندی نوجوانوں کی ہم سے بے تکلف جان پہچان کا اثر یہ ہوگا کہ وہ ہمیں غیر ملکی سمجھنا چھوڑ دیں گے۔ وہ ہمارے اکابر کا ذکر جوش و خروش کے ساتھ کریں گے جس طرح ہم کرتے ہیں اور ہمارے ہی طریقے پر تعلیم پاکر ہمارے ساتھ ہمارے ہی مشاغل میں دلچسپی لے کر ہمارے ہی مقاصد کے حصول کے لیے جدوجہد کر کے وہ ہندوؤں سے زیادہ بالکل اسی طرح انگریز بن جاتے ہیں جس طرح رومن صوبوں کے لوگ

اطالویوں اور فرانسیسیوں سے زیادہ رومن بن گئے تھے۔ آخر وہ کیا چیز ہے جو ہمیں وہ بناتی ہے جو ہم ہیں بجز اس کے کہ ہم انگریزوں کے ساتھ رہتے ہیں، انگریزی بولتے ہیں اور انگریزی اطوار و عادات اختیار کرتے ہیں۔ وہ روزانہ بہترین دل و ذہن رکھنے والے انگریزوں سے ان کی تصانیف کی معرفت تبادلہ خیال کر کے ہماری قوم کی نسبت شاید اس سے زیادہ اچھی رائے قائم کرتے ہیں جیسی وہ انگریزوں سے بالمشافہ بات چیت کر کے قائم کرتے۔ وہ دیکھتے ہیں کہ ہم ہندوستان کے مفادات کو اپنے نظم و نسق کے ذرائع میں کیسے ملحوظ رکھتے ہیں اور وہ متشدد دشمنوں کے بجائے ہمارے ذہین اور جوشیلے مددگار و معاون بن جاتے ہیں۔

''انگلستان اور ہند جیسے دور دراز ممالک کے درمیان موجودہ تعلق کا دائمی اور مستقل ہونا حقیقت کے منافی ہے۔ کسی کوشش و تدبیر سے اور کسی حکمت عملی سے ملکیوں کو انجام کار اپنی آزادی کے حصول سے روک دینا ممکن نہیں لیکن اسے حاصل کرنے کے دو طریقے ہیں۔ ایک انقلاب کے ذریعے، دوسرے اصلاح کے ذریعے۔ ایک میں ارتقائی حرکت فوری اور متشددانہ ہوگی۔ دوسرے میں تدریجی اور پر امن۔ ایک لازمی طور پر ملکیوں کے اور ہمارے درمیان کامل ذہنی بیگانگی اور بیزاری پر منتج ہوگا، دوسرا دائمی دوستی، باہمی نفع بخشی اور خیر خواہی پر۔ ناپسندیدہ نتائج کو روکنے اور پسندیدہ نتائج کو حاصل کرنے کا صرف ایک ہی طریقہ ہے کہ ہم ملکیوں کو یورپی انداز کی ترقی کے حصول میں مصروف کر دیں۔ ایسا کرنے سے وہ قدیم ہندی بنیادوں پر آزادی حاصل کرنے کی خواہش سے دست بردار ہو جائیں گے۔ اس صورت میں فوری تبدیلی تو ناممکن ہوگی مگر ہند سے ہمارا موجودہ تعلق تا دیر قائم رہے گا اور ہمارا موجودہ تعلق پہلے سے بھی زیادہ یقینی ہو جائے گا۔ لوگوں کو یورپی نمونے کی سلف گورنمنٹ کے لئے تیار کرنے کے لیے ایک صدی بمشکل کافی ہوگی۔ کسی قوم کی سیاسی تربیت کے لئے بہت طویل مدت درکار ہے اور جب تک یہ مدعا پورا ہو ہم تا حد امکان محفوظ رہیں گے۔ اور ہماری رعایا میں کوئی طبقہ ایسا نہیں ہوگا جن کے لئے ہمارا وجود اتنا ضروری ہو جتنا ان لوگوں کے لئے جن کے خیالات انگریزی نمونے پر ڈھل گئے ہوں گے۔ یہ جماعت تعداد میں ابھی بہت کم ہے لیکن اس اقلیت میں برابر ان نوجوانوں کا اضافہ ہو رہا ہے جنھوں نے ہمارے مرکزوں میں تربیت پائی ہے۔ کچھ عرصے میں یہ اقلیت اکثریت بن جائے

گی۔ اس وقت یہ ضروری ہوگا کہ لوگوں کی ترقی یافتہ ذہانت اور ان میں سلف گورنمنٹ کی استعداد کے پیش نظر ہم اپنے سیاسی اداروں میں تبدیلی پیدا کریں۔

''اس طرح تدریجا اور پر امن طریقے پر تغیر پیدا ہو جائے گا اور جانبین کی طرف سے کوئی جدو جہد ایک دوسرے کو بیزار کرنے کی نہیں ہوگی؛ اور اس طرح دیسی لوگ پہلے آزادی کا پسندیدہ استعمال سیکھ لیں گے، پھر آزادی حاصل کریں گے۔ اور اپنی نفع بخش رعایا کو اس سے بھی زیادہ نفع بخش حلیفوں میں تبدیل کر لیں گے۔ موجودہ انتظامی تعلق سے صرف بعض برطانوی خاندانوں کا بھلا ہوتا ہے۔ دنیا بھر میں اول درجے کے صنعتی اور اول درجے کے زرعی ملکوں کے مابین خالص تجارتی اتحاد سے پوری برطانوی قوم کی قوت اور فارغ البالی کی نہایت مستحکم بنیادیں استوار ہوں گی۔ اگر یہ راہ اختیار کی گئی تو کوئی علیحدگی واقع ہوگی ہی نہیں۔ ایک خطرناک اور عارضی تعلق ایک بالکل مختلف اور بہت ہی پائیدار تعلق میں بالکل نامحسوس انداز سے تبدیل ہو جائے گا۔ ہمارے ہاتھوں سے مسرت اور آزادی کی تربیت پا کر، ہمارے علوم اور سیاسی اداروں سے مستفید ہو کر، برطانوی احسان کے سب سے زیادہ قابل فخر نمونے کی حیثیت سے ہندوستان باقی رہے گا اور یہاں کے لوگوں کی محبانہ وابستگی اور انکے ملک سے عظیم الشان روابط کی صورت میں ہم عرصہ دراز تک اپنی فراخدلانہ پالیسی اور روشن حکمت عملی کا پھل پاتے رہیں گے جس نے اس طرز عمل کی طرف ہماری رہنمائی کی تھی۔ اس راہ کو اختیار کرنے میں ہم کوئی نیا تجربہ نہیں کر رہے ہوں گے۔ رومیوں نے فی الفور یورپی قوموں کو مہذب بنا دیا اور انہیں رومیوں کے رنگ میں رنگ کر اپنی حکومت سے وابستہ کر کے، بالفاظ دیگر ان کو رومی ادب اور رومی فنون کی تعلیم دیکر، فاتحوں کی نقل اور اتباع کی تربیت دے کر اپنا لیا؛ اور جو مقبوضات جنگی غلبے سے حاصل کئے گئے تھے، فنون امن کی برتری سے مستحکم ہو گئے اور ابتدائی مظالم اور شدائد کی یاد بعد میں پیدا ہونے والے فوائد میں فراموش کر دی گئی۔ اطالیہ، اندلس، افریقہ اور فرانس کے صوبوں میں رومیوں کے اتباع اور ان کی نقلوں میں ان کے ساتھ شریک ہونے کے سوا کوئی آرزو باقی نہ رہ گئی تھی۔ وہ سب تا دم آخر ان کی حکومت کے مطیع و منقاد رعایا کی حیثیت سے وابستہ رہے اور یہ اتحاد اندرونی بغاوت سے نہیں، بیرونی تشدد کی وجہ سے اس وقت ختم ہوا جب فاتح اور مفتوح دونوں ایک ہی ابتلا کا شکار ہو گئے۔

ہندوستانیوں کو بہت جلد ہم سے وہی نسبت ہو جائے گی جو ہمیں رومیوں سے تھی۔ ٹیسیٹس (Tacitus) ہمیں بتاتا ہے کہ جولیس ایگریکولا (Julius Agricola) کی برطانیہ کے سرداروں کی اولاد کو رومی ادب اور رومی علوم کی تعلیم دینے اور ان میں رومی تہذیب وشائستگی کا ذوق پیدا کر دینے کی حکمت عملی یہی تھی۔ ہم جانتے ہیں کہ یہ کس قدر مفید ثابت ہوئی۔ برطانوی لوگ سر کش دشمنوں کے بجائے معتمد دوست بن گئے اور ان کے بزرگوں نے رومیوں کے آنے کی اتنی مزاحمت نہ کی جتنی برطانویوں نے رومیوں کے جانے کی مزاحمت کی۔ یہ بات ہمارے لئے بڑی ہی شرمناک ہوگی اگر بہت ہی اعلیٰ فوائد کی بنیاد پر ہم بھی اپنی قبل از وقت روانگی کو ہندوستانیوں کے لئے ایسی خوفناک مصیبت نہ بنا دیں۔

''ہندو مذہب ایسا نہیں جو آزمائش پر پورا اتر سکے۔ جسے شہادت یا دلیل کہا جاتا ہے، اس سے یہ مذہب اس درجہ بے تعلق اور اس حد تک بے شمار شدید بداخلاقیوں اور طبعی خرافات سے وابستہ ہوگیا ہے کہ یہ یورپی علوم کے سامنے اپنی ہستی کو قائم نہیں رکھ سکتا۔ اسلام اس سے زیادہ سخت جان ہے۔ اس کے باوجود ایک مسلم نوجوان جس نے انگریزی تعلیم پائی ہے۔ اس شخص سے جس نے اپنے باپ دادا کے طریق کامل پر تعلیم پائی تھی، بہت ہی مختلف طرز کا انسان ہے۔ جیسے جیسے یہ تغیر بڑھتا جائے گا، ہندوستان میں بالکل ایک اور ہی ملک بن جائے گا اور اشتعال پذیر مذہبی جذبات کا نام بھی سننے میں نہ آئے گا۔''

یہ اقتباس پڑھ لینے کے بعد کسی ثبوت کی احتیاج باقی نہیں رہتی کہ یہ نظام تعلیم ہمارے خلاف اور برطانوی مفاد کے حق میں کس قدر نتیجہ خیز ثابت ہوا۔

نظام تعلیم کی اصلاح کی تجاویز اور ان کے نفاذ میں موانع

پاکستان کے حاصل ہو جانے کے بعد ہم پاکستان کو اسلام کی اساس پر مستحکم کیوں نہیں کر سکتے؟ اس کا سبب یہ ہے کہ دین کی اساس پر پاکستان کا قیام ''عصر حاضر'' کے لئے ایک چیلنج تھا۔ اس چیلنج کے جواب میں عصر حاضر کے چیلنج کا نعرہ لگایا جو ایک عفریت بن کر ہمارے سامنے کھڑا ہے۔ جب سے ہم استعمار کی گرفت میں آئے تھے، ہم نے جذبہ آزادی کو زندہ رکھا تھا۔ پاکستان کا مطالبہ اسی جذبہ آزادی کا اظہار تھا۔ پاکستان حاصل ہوا، ہم نے یہ سمجھ کر کہ بین الاقوامی

قانون ہماری حفاظت کرے گا نگہداری اور تحفظ کے تقاضوں سے بے نیازی کا انداز اختیار کر کے اپنے آپ کو 'نو استعماریت' کی گرفت میں جانے دیا۔

زندگی ایک بامقصد عمل ہے۔ ہر رائج الوقت نظام کی طرح نظام تعلیم بھی غیر ملکی اقدار کا زر کہ ہے جس کا کوئی تعلق قومی غایت سے نہیں۔ وقتاً فوقتاً رائج ہونے والی تعلیمی پالیسیوں میں جن خرابیوں کی نشاندہی کی گئی ہے وہ تعلیم کے قومی غایت سے عاری ہونے کے نتائج ہیں۔ مثلاً ''تعلیم قومی غایت پیدا کرنے میں ناکام رہی ہے، قومی نشوونما کے لئے اس تعلیم نے کوئی کردار ادا نہیں کیا، تعلیم یافتہ نوجوانوں میں بیروزگاری بہت ہے، اور تعلیمی معیار بہت پست ہے۔'' مجوزہ غایت یہ ہے کہ تمام طلبا کو یکساں ثقافتی فضائل سے مزین کیا جائے اور فضائل کا مجموعہ اپنے کردار میں اسلامی ہونا چاہیے۔

اس غایت کے حصول کے لئے جو ذریعہ تجویز کیا گیا ہے وہ مابعد ثانویات کے درجے تک اسلامی تحقیق (Islamic Research) ہے اور مطبوعات کے ذریعے اسلامی نظریہ حیات کو فروغ دینا ہے۔ یونیورسٹی کی سطح پر اور دوسرے خصوصی اداروں میں اسلامی فکر کا اعادہ تاکید مزید کے ساتھ ضروری قرار دیا گیا ہے۔ اسلامی ریسرچ کی کتنی ہی ہمت افزائی اور سرپرستی کی جائے وہ اس وقت تک کافی نہ ہوگی جب تک شعوری طور پر اس ریسرچ کے نتائج کو تعلیمی پالیسی کا جزو نہ بنایا جائے اور قانون، معاشیات، سیاسیات اور عمرانی علوم کے شعبوں میں ترقی پذیر انداز سے درسی نصابات میں شامل نہ کیا جائے۔

لیکن یہاں سب سے زیادہ قابل غور بات یہ ہے کہ مستشرقین کے اثر نے اسلامی تحقیق کو آثار قدیمہ کی کھدائی، گورکنی اور استخواں کی فروشی میں تبدیل کر دیا ہے کیونکہ وہ اسلام کو بابل، نینوا، مصر اور ہند کی تہذیبوں کی طرح ایک ختم شدہ قوت باور کرانا چاہتے ہیں۔ ان کے نزدیک اسلامی تحقیق کا مسئلہ صرف یہ ہے کہ اسلامی تہذیب کے عروج و زوال کے اسباب کیا تھے؟ مسلمانوں کی قوت اور ضعف کے اسباب کو سمجھ کر انہیں زیر کیسے کیا جا سکتا ہے؟ جو علم اس قسم کے مسائل پر ریسرچ سے حاصل ہوتا ہے، اس سے مسلمانوں کا اعتماد اپنی تہذیب کی برتری کی نسبت ضائع تو ہو سکتا ہے مگر اس کا اثر اسلامی ثقافتی فضائل کے احیاء پر نہیں لایا جا سکتا۔ اسلامی تحقیق کے

جو مسائل مستشرقین تجویز کرتے ہیں وہ مثال کے طور پر اس طرح کے ہیں:

ایک زوال پذیر تہذیب، بدلتی ہوئی دنیا میں اپنے آپ کو بدلے بغیر اپنے تخلیقی کردار پر کیسے فائز ہو سکتی ہے؟

یہ کیونکر ممکن ہے کہ پاکستان تو ایک جدید ریاست اور اس کا آئین اسلامی ہو جبکہ اسلام ادوار وسطیٰ کا تصور ہے۔

مسلمان عصر حاضر کے چیلنج کا جواب کیسے دے سکتے ہیں؟

سائنس اور ٹیکنالوجی کے دور میں اخلاقی اور مذہبی بنیادوں پر انقلاب کیسے ممکن ہے؟

یہ سوالات اس نیت سے وضع کیے جاتے ہیں کہ ان کا جواب نفی میں ہو۔

ہمارا مسئلہ

اگر ہم اثبات میں جواب چاہیں تو ہمیں مسئلے کی تشکیل یوں کرنی ہوگی:

اگر کوئی ایسا گروہ موجود ہو جو محمد ﷺ کی بعثت کی غایت کو حاصل کرنا چاہے تو اس کا نصب العین کیا ہو؟ اس کا معیار کیا ہو؟ اس کی دعوت کیا ہو؟ اس کا لائحہ عمل کیا ہو، جو کلی ہو، مثبت ہو، عملی ہو، قابل عمل ہو، ولولہ انگیز ہو اور حتماً قطعاً اور یقیناً نتیجہ خیز ہو؟

تعلیم، حیات ملی کو دوام واستمرار عطا کرنے کا عمل ہے لہٰذا تعلیم کا مسئلہ یہ ہے۔

کیسے افراد

کیا کام انجام دینے کے لئے

کس نمونہ ثقافت کے حامل معاشرے میں

کون سے نظام افکار پر مبنی معاشرے میں کیونکر پیدا کئے جائیں؟

عملاً اسلام اور تعلیم دونوں کے مسائل ایک ہی ہیں، کیونکہ تعلیم منصب نبوت علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والتسلیم میں داخل ہے۔

اسلام نظام افکار، جس پر ہمارے نظام تعلیم کو مبنی ہونا چاہیے، کیا ہے؟ اس حقیقت کا سمجھنا اس وقت ممکن ہوگا جب ہم اسلام ہی کی اصطلاحوں میں سوچیں۔ مستعار لی ہوئی اصطلاحوں سے دستبردار ہو جانا اس لئے ضروری ہے کہ مانگی ہوئی اصطلاحوں میں سوچنا الہامی ہدایت سے

انحراف کی طرف لے جاتا ہے۔

جہاں تک آئیڈیالوجی کی اصطلاح کا تعلق ہے اسے یوں سمجھنا چاہیے کہ ہر عمل کے لئے ایک نظریہ ضروری ہوتا ہے۔ عام زبان میں نظریہ کو اصول اور اعمال کو ارکان سے تعبیر کرتے ہیں۔ یہی اصول اور ارکان عمرانیات کی زبان میں آئیڈیالوجی (Ideology) اور آرڈر (Order) یعنی نظام فکر اور نظام عمل کہلاتے ہیں لیکن لفظ آئیڈیالوجی کے ساتھ مشکل یہ ہے کہ کسی قوم کی آئیڈیالوجی اور اسی قوم کے افراد کی پیشہ ورانہ تنظیم کے لئے آئیڈیالوجی دو مختلف چیزیں ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آئیڈیالوجی کا تصور انسانی استعداد سے حاصل ہونے والے علم سے ماخوذ جو کلیت اور ہمہ گیری سے عاری ہے۔ اگر ہم آئیڈیالوجی کے متوازی اس کے بالمقابل کوئی اصطلاح استعمال کر سکتے ہیں تو وہ ''کتاب'' ہے، اور آرڈر کے بالمقابل ''سنت'' کی اصطلاح ہے۔ ان اصطلاحوں کو متبادل سمجھنے کی ذرا سی رواداری ہمیں انحراف کی راہ پر لے جائے گی۔

تعلیم کا مسئلہ

اگر مسئلہ تعلیم کی ترتیب بدل کر یہ ہو جائے کہ

کس نظام افکار پر مبنی،

کون سے نمونہ ثقافت کے حامل معاشرے میں،

کیا کام انجام دینے کے لئے،

کیسے افراد،

کیونکر پیدا کئے جائیں؟

اسلامی نظام افکار

اور ہم یہ چاہیں کہ ہمارا نظام تعلیم اسلامی نظام افکار پر مبنی ہو تو سوال پیدا ہوگا کہ اسلامی نظام افکار کیا ہے؟

اسلامی نظام افکار کے چند پہلو ہیں:

ا۔ غایت یا نصب العین

۲۔ تصور کائنات

۳۔ زاویہ نگاہ

۴۔ معیار

۵۔ دعوت

۶۔ لائحہ عمل

نصب العین

قرآن مجید کا نصب العین یہ ہے کہ ایک معاشرہ وحدت نوع انسانی کی وحدت کے تصور پر حق، اخلاقی جدوجہد کرنے والے اور روحانی اللہ بین افراد پر مشتمل قائم کیا جائے۔ ان کی جدوجہد کا رخ یہ ہو کہ فرد اور معاشرہ ہر قسم کے خوف و غم سے محفوظ رہیں جس کے استحکام کی بنیاد محمد ﷺ سے خالص وفاداری ہو اور جسے انجام کار غلبہ حاصل ہو۔ نصب العین کے حوالے سے عروج و زوال متعین ہوتا ہے۔ اسی کے حوالے سے ضبط و انقیاد اور منظم جدوجہد کی احتیاج کا شعور پیدا ہوتا ہے۔ اسی کے حوالے سے افراد کا اپنے ذاتی مفادات سے نکلنا اور اجتماع میں منضبط اور مستحکم ہونا متصور ہے۔

کیا یہ نصب العین حاصل ہو سکتا ہے؟ اس کے لئے ضروری ہے کہ نظام کائنات اپنی ساخت میں اس نصب العین کے حصول کی جدوجہد سے سازگار ہو؟ لہٰذا یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ۔

تصور کائنات کیا ہے؟

یہ عالم اللہ تعالیٰ نے ایک مقصد کے پیش نظر پیدا کیا ہے۔ یہ عالم اس مقصد کے حاصل کرنے کی جدوجہد میں کامیابی سے سازگاری کے اصول پر پیدا کیا گیا ہے۔ اسی مقصد کو حاصل کرنے کی جدوجہد میں ہدایت دینے کے لئے قرآن مجید نازل ہوا ہے۔ ایک کونیاتی قانون ہے جو کونیاتی عمل کو متعین کرتا ہے۔ یہ قانون تضاد کا قانون ہے۔ یہی قانون تاریخی حرکت کو متعین کرتا ہے۔ ہم تاریخی قانون کو یوں بیان کر سکتے ہیں کہ دو گروہ ہوں، ان کے دو مقاصد ہوں، ان کے پیچھے دو وفاداریاں ہوں، ان کے پیچھے دو منظم ارادے ہوں، ان ارادوں کے درمیان تصادم ہو۔ اس تصادم کو کامیاب بنانے کے لئے دو پروگرام ہوں۔ ایک مزعومہ مفاد کی حفاظت کا دوسرا عام نفع بخشش اور مفاد عامہ کی تشکیل کی راہ کھولنے کا۔ مزعومہ مفاد باطل ہے اور مفاد عامہ کی تشکیل حق ہے۔

اللہ تعالیٰ حق کو باطل سے ٹکراتا ہے اور حق باطل پر غالب ہو کر رہتا ہے۔

تاریخی قانون اور اخلاقی قانون میں ایک ربط ہے۔ تضاد کی صورت میں دراصل حق کے باطل پر غالب آنے کی ایک سازگار شرط ہے۔ جب تاریخی تضاد مضمحل ہو جاتا ہے تو اخلاقی اضمحلال پیدا ہو جاتا ہے۔ تضاد سے جدوجہد میں استقامت کے لئے ایک نفسیاتی محرک میسر آتا ہے۔ جتنا تضاد شدید ہوگا اتنا ہی اخلاقی استحکام پیدا ہوگا۔

تصور کائنات وحی سے حاصل ہوتا ہے جو نصب العین کے حصول کی شرط ہے۔ تصور کائنات کی خصوصیت یہ ہے کہ موجودہ حالات، چیزوں اور واقعات اور مستقبل کے امکانات کا جائزہ ہے جس کی بنیاد پر نصب العین کا حصول متصور ہو سکتا ہے۔

زاویہ نگاہ

یہ موقف ہے جس کے حوالے سے چیزوں اور اعمال پر نظر کی جاتی ہے۔ جس کے تعلق میں ان کا موازنہ کیا جاتا ہے۔ اور تخمینہ لگایا جاتا ہے۔ رحمت کا نقطہ نظر ہی دراصل وہ اجتماعی ذہن مہیا کرتا ہے جس کا ہر متنفس آرزومند ہے۔ اس کے بغیر نہ تو فرد انفرادیت سے نکل کر معاشرہ کا رکن بن سکتا ہے، نہ خود غرضی سے نکل کر باہر آ سکتا ہے۔

معیار

معیار یا پرکھنے کے اصول کے حوالے سے انفرادی اور اجتماعی مسائل کو پرکھا جاتا ہے۔ وحی سے حاصل ہونے والا حکم معیار ہے۔ جو اعمال حکم کی تعمیل میں صادر ہوتے ہیں وہ خیر ہیں اور جو حکم کی خلاف ورزی میں سرزد ہوتے ہیں، اخلاقی شر ہیں۔ محمد ﷺ کی ذات گرامی نمونہ کمال کی حیثیت رکھتی ہے جس کے حوالے کے بغیر نہ تو کسی خیر و کمال کا خیر و کمال ہونا باور آ سکتا ہے نہ اس کا قابل حصول ہونا۔

دعوت

دعوت کی خصوصیت یہ ہے کہ دعوت ہی سے جماعت کی بقا، اس کا دوام و استمرار وابستہ ہے۔ جماعت دعوت پر مامور ہے دعوت و تبلیغ کی بدولت عالمگیر وفاداری پر منظم معاشرہ دوسرے

تازہ دم گروہوں کو اپنے اندر شامل کر کے اختلال سے محفوظ ہو سکتا ہے۔ بخلاف اس کے محدود وفاداریوں پر منظم گروہوں کی معذوری یہ ہے کہ جب تاریخی جدوجہد میں ان کے اعصاب تھک جاتے ہیں تو وہ زوال کے بعد دوبارہ ابھرنے کی صلاحیت سے محروم ہو جاتے ہیں۔

لائحہ عمل

لائحہ عمل یا پروگرام پہلے سے متعین کیا ہوا فرائض و اعمال کا وہ گوشوارہ ہے جس سے مطلوبہ نتائج پیدا ہو کر رہیں۔ اس کے تین مدارج ہیں، انفرادی، اجتماعی اور بین الاقوامی۔ پہلے مرحلے میں تلاوت آیات تزکیہ، تعلیم کتاب وحکمت پر اصرار ہے۔

دوسرے مرحلے پر لائحہ عمل سے ادارات وجود میں آتے ہیں۔ افراد اور ادارات کے عمل کو منظم رکھنے کے لئے لائحہ عمل ان اوامر و نواہی پر مشتمل ضابطہ ہے جن کے ذریعے اسلامی فضائل کو محفوظ اور ان کے خلاف ارتکاب جرائم کو مسدود کیا جا سکے۔

تیسرے مرحلے پر پروگرام ان سوالات کے جوابات پر مشتمل ہے۔

کونسا مخصوص تضاد اپنے اندر یہ ضمانت رکھتا ہے کہ اسے ابھارا جائے تو وفاداری متعین ہو، جماعت منضبط ہو اور تصادم فیصلہ کن؟

یہ تضاد محمد رسول اللہ ﷺ کی تصدیق اور تکذیب کا تضاد ہے۔

یہ تضاد کیونکر ممکن ہوا؟ اس کے لئے خود اپنی نسبت قرآن مجید کے اس دعویٰ پر نظر کریں کہ وہ ''الفرقان'' ہے اور غور کریں کہ قرآن مجید بحیثیت ''الفرقان'' کے کن امتیازات اور اختلافات اور فروق کو واضح کر کے اپنے آپ کو ''الفرقان'' ثابت کرتا ہے تو سب سے بنیادی فرق محمد رسول اللہ ﷺ کی تصدیق اور تکذیب کا تضاد برآمد ہوگا۔

کیا ضمانت ہے کہ بین الاقوامی سطح پر استحکام کی یہ جدوجہد تخریب محض میں ختم نہیں ہوگی اور اس سے تعمیری نتائج پیدا ہوں گے؟

اس کی ضمانت اس کے طریق کار کی نفع بخشی میں ہے۔

جب تک تصادم کو دعوت دینے کی طاقت نہ ہو، پروگرام کیا ہو کہ ولولہ سرد نہ ہو، مقاصد کے قریب تر ہوتے جائیں اور قبل از وقت تصادم کو التوا میں رکھنے پر قدرت رہے۔

جماعت کے اندر سے تقویت پہنچانا اور اسکے ارکان کی تخلیق جدوجہد سے تعطل دور کر کے انہیں تصادم کے لئے تیار کرنا ہی وہ پروگرام ہے۔ یہ پروگرام دشمنی کے کسی ضابطے کی رو سے قابل اعتراض نہیں ہو سکتا۔ جب ارکان اتنے قوی ہو جائیں کہ جان کی بازی لگانے کی پوزیشن میں آجائیں اور جارحانہ اقدام کا جواب دے سکیں تو تصادم قبل از وقت نہیں ہوگا۔

اس پروگرام کے کتنے اقسام کے ردعمل پیدا ہوں گے، اس کی بے خطا پیش بینی کی جائے۔

اس کا قرآنی جواب یہ ہے کہ تین طرز کا ردعمل پیدا ہوگا، ایمان، کفر اور منافقت۔ اور اس سے تین گروہ وجود میں آئیں گے: مومن، کافر اور منافق اور قرآن مجید ان سب کی سیرت اور نفسیات کو بیان کرتا ہے۔

ہر ایک گروہ کی طرف کیا طرز عمل اختیار کیا جائے کہ صورت حال پر تقررت آپ کو حاصل ہو جائے؟

قرآن مجید اس بات میں نہایت واضح ہدایت مہیا کرتا ہے۔ چونکہ تعلیم قوموں اور تہذیبوں کو دوام و استمرار عطا کرنے کا علم ہے، اس لئے تعلیم ہی سے ابتدا کرنا صحیح اقدام ہوگا اور جب تک ہم بحالات موجودہ علوم کے بے نتیجہ ہو جانے کا جائزہ لے کر تجدید علوم کے ارادے سے اعلیٰ ترین سطح پر جدوجہد نہیں کریں گے، ہم ان علوم کی دریوزہ گری سے بے نیاز نہیں ہو سکتے جو معاندانہ عمرانی ثقافتی ماحول میں ہماری زندگی پر استعماریت کی گرفت کو مضبوط کرنے کے لئے غیر ملکی اقتدار نے اپنے نافذ کردہ نظام تعلیم کے ذریعے ہم پر مسلط کئے تھے۔ ان کی اختلال انگیزی کا تدارک بہتر نظام تعلیم سے ہو سکتا ہے۔

موجودہ نظام تعلیم میں مذہب اور فلسفے کے مابین التباس نے یہ موقف پیدا کیا ہے کہ مذہب اور فلسفے کا مسئلہ تو ایک ہے مگر جوابات متضاد ہیں اور اس مسئلے کا جو جواب مذہب سے حاصل ہوتا ہے، صحیح ہے۔ حقیقت یہ نہیں لیکن اگر اسے صحیح سمجھ لیا جائے تو مذہب بھی فلسفے کی طرح عمل کے لحاظ سے بے نتیجہ ہو جاتا ہے کیونکہ فلسفے کا مسئلہ مذہب سے حل کرنے کے بعد عمل کے لئے کوئی محرک باقی نہیں رہتا۔

فلسفے کا وظیفہ، اصلی حقائق کی صحت کی اساس مہیا کرتا ہے۔ شعور مذہبی کے مضمرات کا انکار کر
نہیں۔ جن لوگوں نے فلسفے اور سائنس کے مسئلے کو مذہب کا مسئلہ سمجھا ہے ان کی معذوری یہ ہے کہ
ان کا علم مطلوبہ نتائج تک نہیں پہنچاتا۔

فلسفے اور مذہب میں فرق ہے۔ فلسفے کا مسئلہ تو یہ ہے کہ حقیقت ہے کیا؟ اور نظر
حقیقت کی تلاش میں فلسفے کو حقیقت سے زیادہ منہاج پر اصرار رہا ہے اور مذہب اس کائنات میں
انسانی نصب العین کو متعین کرنے کے بعد اس کے پانے کی بے خطا تدبیر پر مصر ہے: یعنی مذہب
مسئلہ یہ ہے کہ انسانی زندگی اپنے انفرادی اور اجتماعی پہلوؤں میں پسندیدہ نمونے پر ڈھلے کیسے
یعنی انسان اپنے نصب العین کو کیونکر حاصل کرے؟

دین کے مسائل

جن مسائل کے حل کرنے پر مذہب کو اصرار ہے وہ یہ ہیں:

انسان کی علمی استعداد کے ناقص ہونے کے باوجود اس کی علم حقیقت کی آرزو کیسے پوری ہو؟

انسان اخلاقی کمال کیسے حاصل کرے؟

اس کا پورا ماحول ایک اخلاقی نظام میں کیسے بدلا جائے؟

اس کی جمالیاتی طلب کیسے پوری ہو؟

اس کے جمالیاتی سرور کو دوام واستمرار کیسے میسر آئے؟

اس کے شعور مذہبی میں مضمر آرزو کیسے پوری ہو؟ یعنی اس کی پوری زندگی اللہ تعالیٰ کی حضوری کے
شعور میں کیسے بسر ہو؟

افراد کے درمیان کشمکش سے نجات کیسے ملے؟

فرد معاشرے کے ظلم سے اور معاشرہ فرد کی ایذا رسانی سے کیونکر محفوظ ہو؟

بین الاقوامی عداوت وعناد سے کیونکر نجات ملے؟

ریاستوں، قوموں اور تہذیبوں کے تصادم کا علاج کیا ہو؟

ان مسائل کو حل کرنے کے لئے جو ضبط واختیار ضروری ہے، اس کا پابند انسانی شخصیت کو کیسے
جائے؟

ذمہ داری کا احساس اور کامیابی سے اس صورت حال کا مقابلہ کرنے کا اعتماد کیسے بہم پہنچایا جائے؟
یہ سب کچھ تعلیم ہی سے ممکن ہونا چاہیے لیکن کونسا نظام تعلیم ان مسائل کو حل کر سکے گا؟ اسلام ایسے
نظام تعلیم کی اساس کیسے بن سکتا ہے؟

(۱۹۵۲ء میں پنجاب یونیورسٹی نے اس سوال کو حل کرنے کی ایک ناکام کوشش کی تھی جسے بے نتیجہ
سمجھ کر داخل دفتر کر دیا گیا تھا)

دراصل تعلیم منصب نبوت میں داخل ہے اور کتاب اور سنت سے جو نصب العین متعین
ہوتا ہے اگر کتاب وسنت سے اس کے حصول کی ضمانت حاصل نہ ہو تو ہمارے پاس نہ تو یقین کے
لئے کچھ باقی رہتا ہے، نہ تلقین کے لئے۔

تعلیم کے مسئلے کے اجزاء پر ترتیب وار غور کریں تو مسئلے کا حل یہ ہوگا۔

(الف) کیسے افراد؟

نظام تعلیم کے ذریعے ہمیں ایسے افراد پیدا کرنا ضروری ہے جو اخلاقی جدوجہد کرنے
والے اور روحانی الذہن ہوں، جو کتاب وسنت کی روشنی میں عصر حاضر کے چیلنج کا جواب دے سکیں
، جو قرآنی تدبیر سے انفرادی اور اجتماعی حقوق کے تضاد اور تصادم رفع کر سکیں۔ یہ اس لئے ضروری
ہے کہ عصر حاضر میں دو متضاد اور متصادم عمرانی نظام رائج ہیں جن میں ایک سرمایہ داری معیشت کا
حامل ہے اور انفرادی آزادی اور انفرادی حقوق کے مطالبے اور تحفظ کا نعرہ لگاتا ہے اور دوسرا
اشتراکی معیشت کا حامل ہے اور اجتماعی حقوق کے مطالبے اور تحفظ کا نعرہ لگاتا ہے۔ یہ دونوں نظام
انفرادی اور اجتماعی حقوق کے تضاد اور تصادم کو رفع کرنے سے عاجز ہیں کیونکہ سرمایہ داری معیشت
اجتماعی حقوق کو نظر انداز کر دیتی ہے اور اشتراکی معیشت انفرادی حقوق کی منکر ہے۔ جب تک ہمارا
نظام تعلیم ایسے افراد پیدا نہیں کرے گا، ہمارے نوجوان اسلامی نعروں کی بے تاثیری سے پیدا
ہونے والی تلخی کے ردعمل کے طور پر اشتراکی نعروں کے اثر سے محفوظ نہ رہ سکیں گے۔

(ب) کیا کام انجام دینے کے لئے؟

وحی کی ہدایت کے مطابق زندگی کے ہر پہلو میں عصر حاضر کے چیلنج کا جواب دینے والی
قیادت کی ذمہ داری ادا کرنے کے لئے۔ اور یہ تب ممکن ہوگا جب ہمارا نظام تعلیم ہمیں مغرب

جدیدہ کی علمی دریوزہ گری سے بے نیاز کر کے مغرب کی ذہنی اور علمی امامت کا انکار کرنے کی صلاحیت عطا کرے۔

(ج) کس نمونہ ثقافت کے حامل معاشرے میں؟

حقیقت یہ ہے کہ اسلامی نمونہ ثقافت، حسی ثقافت اور تخیلی ثقافت سے قطعاً مختلف ہے، اور مادیت اور روحانیت کو ملانے کا نعرہ سوائے ابہام اور التباس کے اور کوئی نتیجہ پیدا نہیں کرسکتا۔ یہ نعرہ ان مسائل کو حل نہیں کرسکتا کہ تعلق باللہ (عبدیت) اور عمرانی تقاضوں سے پیدا ہونے والے روابط میں ہم آہنگی کیسے پیدا ہو؟ اخلاق اور معیشت ایک دوسرے سے کیوں کر سازگار ہوں؟ انفرادی اور اجتماعی حقوق کا تضاد و تصادم کیسے رفع ہو؟ دین اور سیاست کیسے ایک ہوں اور کیوں کر ان کی وحدت برقرار رہے؟ وحی سے حاصل ہونے والے اخلاقی قانون اور تاریخی قانون کے ربط کو کس طرح سمجھا جائے؟

تعلیم کی اساس، اسلامی نظام افکار ہونی چاہیے جس کی نشاندہی کی جاچکی ہے مگر یہ بھی ممکن ہوگا جب کہ نظام تعلیم ''دینی'' اور ''دنیاوی'' کی ثنویت سے پاک ہوگا۔ نظام تعلیم میں یہ ثنویت مغربی نقطۂ نگاہ سے پیدا ہوتی ہے۔

نظام تعلیم کے مضمرات:

ایسا نظام تعلیم پیدا کرنے کے لئے تین شرطوں کا پورا کرنا ضروری ہے (۱) نصاب (۲) اساتذہ (۳) طلبہ

نصاب

ہمارا نصاب تعلیم ایسے نصاب پر مشتمل ہے جو مستعمراتی نظام کے غلبے کو برقرار رکھنے کے لئے وضع کیے جانے والے علوم سے بنا ہے، جو مستعمراتی نظام کا ترکہ ہیں اور یہ علوم ایک معاند تہذیب کے اساطین نے مدون کیے ہیں۔ ہماری تہذیب و ثقافت کی تنقیص کے لئے یہ علوم مدون ہوئے ہیں اور اب وہ سب علوم اس درجہ عقیم ہو چکے ہیں کہ ان کا کوئی اثر قومی استحکام کی جدوجہد پر نہیں لایا جاسکتا۔ ہم اپنے معاشئین کے علم کی مثال لیں تو معلوم ہوگا سیاسی آزادی کا مظہر معاشی

طور پر آزاد ہوتا ہے۔ قیام پاکستان کے بعد جو آزادی حاصل ہونی چاہیے تھی اس سے ہمارے ماہرین معاشیات نے ہمیں محروم کر دیا ہے۔

معاشیات: وہ ہماری معیشت پر دوسروں کی گرفت کو شدید تر کرنے کی تدبیر تو جانتے ہیں اور اسی کو علم سمجھتے ہیں۔ مگر ہماری معیشت کو دوسروں کی گرفت سے آزاد کرانے کی تدبیر سے بے خبر ہیں۔ ایک آزاد ملک میں علم اور تعلیم کے تقاضے پورے کرنے کے لئے بالکل مختلف قسم کا ذہن درکار تھا۔ جب تک معاشیات کے علم کی تدوین نو نہ کی جائے گی۔ ہم کبھی ایسے علم کی دریوزہ گری سے بے نیاز نہ ہوں گے جو ہمیں محکوم اور ذہنی طور پر غلام بنائے رکھنے کے لئے وضع کیا گیا تھا۔

تاریخ: ہم تاریخ کو لیں تو معلوم ہوگا کہ ہمارے ماہرین کے نزدیک تاریخ اسلام ایک بے معنی تصور ہے۔ ان میں سے بعض کا خیال ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے بعد خلافت راشدہ تک اسلام کی تاریخ ہے اور وہ بھی ایسے اسلام کی جس کی بدولت خلافت راشدہ بھی قصاب خانے کی تصویر معلوم ہوتی ہے۔ ہم اپنے ماضی کے احترام سے اپنے انہی ماہرین تاریخ کی بدولت محروم ہو گئے ہیں۔ اگر قرآنی تعبیر تاریخ کی روشنی میں ہم اپنی تاریخ کی توجیہ نہ کرسکیں تو کبھی حیات ملی کے استحکام پر تاریخ کے مطالعہ سے کوئی اثر نہ پیدا کرسکیں گے۔ ہمارے موجودہ ماہرین تاریخ کی نظر میں ہماری تاریخ ''وحدت'' اور ''تسلسل'' کے خصائص سے عاری ہے۔ کیونکہ انکے نزدیک بنو امیہ اور بنو عباس کے دور کی تاریخ ایسی ثقافت کی تاریخ ہے جو غیر اسلامی ثقافتوں سے ماخوذ ہے، ایران کی تاریخ ایرانی قومیت کی تاریخ ہے، ہمعصر ترکی اور عرب کی تاریخ ترک اور عرب نسلیت کی تاریخ ہے اور اندلس اور اسلامی ہند کی تاریخ ان واقعات کی تاریخ ہے جو ان سرزمینوں پر گزرے ہیں۔ وحدت اور تسلسل تاریخ کی جان ہے۔ مگر ہماری تاریخ وحدت و تسلسل سے عاری ہے۔

فلسفہ: فلسفے کے جو نصاب ہماری یونیورسٹیوں میں رائج ہیں انکا جائزہ لیں تو معلوم ہوگا کہ ان نصابوں کا مقصد نہ تو فلسفہ سکھانا ہے نہ اسلام کے نقطہ نظر سے ان پر تنقید کرنا ہے کیونکہ ان نصابوں میں فلسفے کا درس فضائل و اقدار کے نقطہ نگاہ سے نہیں دیا جاتا۔ اختباجیت (Pragmatism)، مثبتیت (Positivism) اور موجودیت (Existentialism)

جیسے نظریات کو داخل نصاب کرنے کا اگر کوئی مقصد ہے تو یہ ہے کہ ہمارے نصابات یونیسکو کے تجو
کردہ نظام تعلیم سے سازگار ہو جائیں۔

مسلمانوں کے فلسفہ فکر کی نشوونما کی توجیہ کے بارے میں ہم نے ڈی بو (De-Boer) کا نقطہ نظر قبول کیا ہے جس نے تاریخ فلسفہ اسلام مرتب کی تھی۔ ڈی بور ایک مستشرق ہے، فلسفے کا طالب علم نہیں۔ اسکا موقف یہ ہے کہ فلسفے اور ثقافت میں اسلام اور مسلمانو کا کوئی کارنامہ نہیں ہے، اخلاق، تصوف اور مذہب مسیحیت سے مستعار لئے ہیں، اسلامی قانو یہودیت اور رومن لا سے، فلسفہ یونانی فکر سے ماخوذ ہے، ادب اور معاشرہ جاہلیت کے عرب کی نسلی میراث ہے اور معصر فلسفے میں مسلمانوں کا کوئی فکر پیش نہ کر سکنے کی معذرت میں یہ کہا کہ جب خود یورپ میں بھی فلسفے کا زوال ہو چکا ہے تو ہم بھی کوئی فلسفہ مدون نہ کر سکے ہوں تو کیا حرج ہے گویا ہم زوال وانحطاط میں مسابقت کے لئے کوشاں ہیں۔

مگر یہ اس لئے کہا گیا کہ مسلمانوں کے فلسفے کی نشوونما کی توجیہہ کی ذمہ داری جن لوگوں کو سونپی گئی تھی وہ اس شعور سے بھی محروم تھے کہ فلسفیانہ غور وفکر کے محرکات کیا ہوتے ہیں۔ ہمارے اپنے لوگوں نے (اگر اسلامی تہذیب سے غداری کرنے والے کو "اپنا" کہا جا سکتا ہو) فلسفیانہ فکر کی نشوونما کی یہ غلط توجیہہ کیوں قبول کی؟ اس کی وجہ وہ خطرہ ہے جو عصر حاضر کی تہذیب کے لئے پیدا ہو گیا ہے۔

جدید تہذیب کے بڑے بڑے اساطین جیسے اوسولڈ اشپنگلر، پی۔ اے۔ سوروکن آرنلڈ ٹوائن بی، برٹرینڈرسل اس نتیجے پر پہنچنے میں بالکل یک زبان ہیں کہ جدید تہذیب تباہی کے کنارے پہنچ چکی ہے اور اب اس کا باقی رہنا ناممکن ہے۔ جدید تہذیب کے اوئی درجے کے محافظوں کا خیال ہے کہ اگر مسلمانوں کو یہ باور کرایا جائے کہ وہ مغربی تہذیب کی نقالی کے بغیر ترقی نہیں کر سکتے تو مغرب کی اس مٹتی ہوئی تہذیب کے نابود ہونے میں ابھی کچھ عرصہ لگے گا۔ اس لئے ہمارے اندر سے ایسے لوگوں کو بطور اجیروں کے منتخب کر کے، جن کا ذہن غلام ہے، اس خیال کی اشاعت کرانا چاہتے ہیں کہ جب اسلامی تاریخ کے ہر دور میں مسلمان مغربی تہذیب کے زیر بار احسان رہے ہیں تو آج بھی اگر انہیں مغربی تہذیب کی نقالی کرنی پڑے تو حرج کیا ہے۔ یہ اقدا

ہم میں سے ان لوگوں کو ضروری معلوم ہوتا ہے جو مستشرقین کے زیر اثر اسلام کو ایک ختم شدہ قوت سمجھتے ہیں۔ لیکن مسلمانوں کی عداوت جس شدت سے دنیا کی تمام طاقتوں کو درپیش ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ رائے غلط ہے، کیونکہ خیر الامم مر نہیں سکتی۔ جو قوم جان کی بازی لگانے کا ولولہ رکھتی ہے وہ ابھی مری نہیں۔ اس کا زندہ ہونا ہی اس عداوت کا محرک ہے۔ ہمیں اپنے نظام افکار کی اساس پر خود غور کرنا ہوگا۔

اسلامیات

نہ صرف تاریخ اور فلسفہ بلکہ اسلامیات کا نصاب بھی مستشرقین کے زاویہ نگاہ سے متعین ہوا ہے۔ اسلام پر کوئی تصنیف اس اعتماد کو بحال نہیں کرتی کہ عقائد، جو اوہام باطلہ بن گئے ہیں، از سر نو عقائد راسخہ بن سکتے ہیں اور عبادات، جو رسوم وظواہر بن گئی ہیں، پھر سے حقیقی عبادات بن سکتی ہیں۔

خود قرآن مجید کا مطالعہ تک کسی ایسے منہاج کے مطابق نہیں ہو رہا جس سے قرآنی علم میں یکسانی کا نمونہ پیدا ہو سکے اور یہ یقین بحال ہو کہ قرآن مجید جو نتائج پیدا کرنا چاہتا ہے ان کے پیدا ہونے کی کوئی ضمانت بھی مہیا کرتا ہے۔ دینی یا لادینی کسی نظام تعلیم میں پورا قرآن مجید داخل نصاب نہیں۔

ہر چند کہ علوم دینیہ کے وہ تمام نظام جو ہماری یونیورسٹیوں میں پڑھائے جاتے ہیں، اسلامی فضائل کے احیاء میں بے اثر ہو گئے ہیں لیکن تعلیم کی نئی مجوزہ پالیسی میں اس حقیقت کو تسلیم کر کے غور کیا جائے تو یہی بے اثری اسلامی تحقیق اور علوم دینیہ کی تجدید اور تدوین نو کی محرک بن سکتی ہے، لیکن اس احتیاج کا شعور اس وقت تک پیدا نہ ہوگا جب تک علوم اسلامیہ کی منہاجیات (Methodology) کی بے تاثیری کا اندازہ نہ ہو اور اس میں موقع پرست اجارہ دار حائل ہیں۔

نہ صرف علوم دینیہ کا یہ حال ہے جس کی نشاندہی کی گئی ہے بلکہ سائنس کی ترقی کے اس قدر بلند و بانگ دعووں کے باوجود سائنسی علوم کے مفروضات (Hypotheses) کے درمیان جو تضاد اور تناقض موجود ہے وہ ابھی تک رفع نہیں ہوا۔ ان مفروضات کو غیر تنقیدی انداز

سے منطبق کرنے میں ان کی صحت علمی کے حدود اور امتیازات کا شعور مدنظر نہیں رہتا۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ علمی نقطۂ نظر سے صرف التباس پیدا کیا جا رہا ہے۔

اسلام کے نقطۂ نگاہ سے نصاب کو صحیح بنیادوں پر مرتب کرنے کی صرف یہ صورت ہے کہ ان نظامہائے علم کی، جو استعمار پرستی کی بدولت ہمارے ہاں مروج ہوئے ہیں، خرابی کو سمجھ کر مغرب کی علمی اور فکری امامت کا انکار کر کے اپنے نظام افکار کی روشنی میں علوم کی تجدید اور تدوین نو کی جدوجہد کی جائے۔ اس مقصد کے پیش نظر تمام علوم کو بدلنا ہوگا مثلاً عمرانیات میں صحیح نتائج پیدا کرنے کے لئے یہ سمجھنا ضروری ہوگا کہ ایک صحت مند اسلامی معاشرے کا وجود مقدم ہے۔ عمرانیات کی صورت میں اس موضوع سے بحث کرنے والا علم مؤخر ہے تو سوال پیدا ہوگا کہ اسلامی معاشرہ کن شرائط کے پورا کرنے سے وجود میں آسکتا ہے؟ اس کے لئے جس نظام فکر کی طرف گذشتہ بحث میں نشاندہی کی گئی ہے اس کے حوالہ سے غور کرنا مؤثر ہوگا۔

معاشیات کے سلسلے میں یہ بات غور طلب ہوگی کہ کس طرز کی جدوجہد سے ہماری معیشت دوسروں کی گرفت سے آزاد ہو سکتی ہے اور اس جدوجہد کی بنیاد پر معیشت کو ایک عمرانی عمل سمجھتے ہوئے اس کے اصول اور اس کے مظاہر کی توجیہ کی شکل میں کس نوع کی معاشیات مدون ہو سکے گی۔

تاریخ کی نسبت صحیح ذہن پیدا کرنے کے لئے پہلے تو یہ فیصلہ کرنا ہوگا کہ اسلام کی تاریخ کے دو ادوار کے درمیان کیا نسبت ہے۔ یعنی دور نبوت اور دور مابعد نبوت کے درمیان اور یہ سمجھنا ضروری ہوگا کہ تاریخ کے تاریخ ہونے کے لئے وحدت اور تسلسل کا ہونا ناگزیر شرط ہے۔ دور نبوت کی تاریخ معیاری دین کی تاریخ ہے اور دور مابعد نبوت کی تاریخ معمول بہ دین کی تاریخ ہے اور تاریخی حرکت کے نتائج جس قانون کے تحت متعین ہو رہے ہیں اس کے حوالے کے بغیر عروج و زوال کا سمجھنا اس لئے ناممکن ہوگا کہ تاریخ قوموں اور تہذیبوں کے عروج و زوال کی توجیہ کا علم ہے اور قرآن مجید کے نزدیک نوع انسانی کی ہدایت کا نظام جتنا اہم ہے اتنا ہی اہم وہ قانون ہے جس سے قوموں اور تہذیبوں کے عروج و زوال کی توجیہ کی جا سکتی ہے۔

فلسفہ کو اسلامی نقطۂ نگاہ سے مدون کرنے کے لئے اس سوال کے پیش نظر غور کرنا

ضروری ہوگا کہ قرآن مجید اپنے مخاطبوں کے سامنے جو نصب العین پیش کرتا ہے اور اسے حاصل کرنے کی جدوجہد میں کامیابی کے لئے جو تصور کائنات ضروری ہے وہ قرآن کے نزدیک کیا ہے۔

علوم فطرت میں صحیح نقطۂ نظر پیدا کرنے کے لئے یہ ضروری ہوگا کہ طبیعی، حیاتیاتی اور نفسیاتی علوم کے مفروضوں (Hypotheses) میں جو تضاد پایا جاتا ہے وہ رفع کیا جائے جسے مغربی تہذیب سائنسی ترقیات کے دعووں کے باوجود ابھی تک رفع نہیں کر سکی ہے۔ اس تضاد کو رفع کئے بغیر علوم کے سلسلے میں کوئی اطمینان بخش نقطۂ نظر پیدا نہیں ہو سکے گا۔

جہاں تک اسلامی علوم کا تعلق ہے، ان کی تجدید اور تدوین نو اس وقت ممکن ہوگی جب ہمارا نقطۂ نظر اسلامی علوم کے باب میں اس زاویہ نگاہ سے متعین ہوگا کہ کس طریقہ کار میں ہماری انفرادی اور اجتماعی زندگی، اسلامی نمونے کے مطابق ڈھلنے کی ضمانت ہے۔

اساتذہ

جہاں تک معیاری اساتذہ کے تربیت دینے کا تعلق ہے، اس کے لئے اساتذہ کو یہ نقطہ نگاہ اپنانا پڑے گا کہ ہمیں مغرب کی زوال پذیر تہذیب کے اثر سے نکل کر اسلامی فکری اساس کو اپنا کر اپنے منصب کی ذمہ داری کو پورا کرنا ہے جس کے لئے تین شرطیں ضروری ہیں:

(۱) اپنے اپنے فن میں ان کو صحیح بصیرت اور علمی اعتبار سے ایک باوقار حیثیت حاصل ہونا ضروری ہے۔

(۲) طالب علموں کی مشکلات کے پیش نظر ہر روز درس و تدریس کے سلسلے میں جتنی محنت کرنا درکار ہے اسے اپنے اوپر لازم کریں۔

(۳) طالب علموں کے بہی خواہ ہوں اور اس سلسلے میں ہر طالب علم کے مسائل سے دردمندانہ تعلق سے عاری نہ ہوں اور تا حد امکان اپنے شاگردوں کی بہتری کے لئے کوشاں رہیں تو ناممکن ہے کہ وہ اپنے کھوئے ہوئے مقام کو دوبارہ حاصل نہ کر لیں۔

طلبہ

طالب علم کی زندگی میں جب تک یہ مقصد پیدا نہ ہو کہ اسے زندگی کے ہر میدان میں

قیادت کا فریضہ ادا کرنے کے لئے قرار واقعی اہلیت پیدا کرلی ہے، اس وقت تک یہ توقع رکھنا کہ نوکرشاہی کے مناصب کی آرزو اس کی زندگی کو اس علم سے مزین کرسکتی ہے جو بین الاقوامی سطح پر قوم کو باوقار بنانے کے لئے ضروری ہے، کبھی بھی پوری ہونے والی توقع نہیں ہے۔

اسلامی اساس پر پاکستان کے استحکام کی ناگزیر شرط یہ ہے کہ قوم کے نوجوانوں کو اس حقیقت سے خبردار کیا جائے کہ معاشی انقلاب کی اسلامی تدبیر کیا ہے؟ یہ تبھی ممکن ہوگا جب ان سوالات کا جواب نوجوانوں کو مہیا کیا جائے جن کے حل ہونے کی انہیں شدید احتیاج ہے مگر وہ خود ان مسائل کا حل تلاش کرنے سے قاصر ہیں۔

نوجوانوں کے مسائل

جدید تعلیم یافتہ نوجوان اور ان میں سے بالخصوص وہ جو جدید تحریکات اور علوم جدیدہ سے باخبر ہیں، ایسے مسائل سے دوچار ہیں:

وحی ذریعہ علم ہے یا نہیں؟

کیا وحی سے وہ علم بھی حاصل ہوتا ہے یا نہیں جو انسانی زندگی کے ارتقاء کے لئے ضروری ہے؟

کیا سیاسی اور معاشی حالات اور تقاضوں کے بدل جانے سے وحی سے حاصل شدہ علم اپنے مقاصد کی تکمیل کے لئے اپنے طریق کار میں ضروری تبدیلی پیدا کرسکتا ہے؟

کیا وہ علم جو وحی سے حاصل ہوتا ہے ایسا فکر مرتب کرسکتا ہے یا نہیں جس سے تاریخی ادوار کا ربط ضائع نہ ہو؟

کیا کوئی تاریخی قانون ہے جو تاریخی حرکت سے پیدا ہونے والے نتائج پر اثر انداز ہے؟

کیا کوئی کائناتی قانون ایسا ہے جو کوئیاتی عمل پر اثر انداز ہے؟

کیا تاریخ قانون اور کائناتی قانون کے درمیان ہم آہنگی ہے؟

کیا پیغمبرانہ قیادت کے عطا کردہ، اخلاقی قانون اور تاریخی قانون کے درمیان کوئی ربط ہے؟ اگر تاریخی قانون، تضاد کا قانون ہو تو اخلاقی قانون کی حیثیت کیا ہوگی؟

اگر تاریخ سے اخلاقی قانون کی شکست اور تاریخی قانون کا غلبہ نظر آتا ہو زندگی میں اخلاقی قانون کی کیا جگہ رہے گی؟

اگر قانون تضاد کو تسلیم کرلیا جائے تو تصادم کو پرکھنے کا معیار کیا ہوگا؟

اگر تضاد کے ابھرنے ہی سے حرکت پیدا ہوسکتی ہے تو کیا ضمانت ہوگی کہ چھوٹے دائروں میں تضاد تباہ کن ثابت نہ ہوگا؟

تنگ دائرے کے بجائے وسیع تر دائرے میں تضاد سے حرکت پیدا کرکے زندگی میں نشوونما کی ضمانت کیا ہوگی؟

سرمائے کی نسبت وحی سے حاصل شدہ علم کا نظریہ کیا ہے؟ یعنی وہ سرمائے کو محنت پیشہ لوگوں سے سطحی طور پر وابستہ کرتا ہے یا بنیادی طور پر؟

اگر وہ علم سرمائے کو بنیادی طور پر محنت پیشہ لوگوں سے وابستہ کرتا ہے تو سرمایہ داری کی بنیادی شکلوں کی نسبت کیا رائے رکھتا ہے؟

سرمایہ داری کی نسبت کس نقطہ نظر سے محدود اجازتیں دی جاتی رہی ہیں؟

وراثتی قانون کی نسبت اس علم کا بنیادی نظریہ کیا ہے؟

مختلف حالات کو سنبھالنے کے لئے کن اصولوں پر تبدیلیاں پیدا کرتا ہے؟

فرد کا جماعت پر اور جماعت کا فرد پر کیا حق ہے؟

کیا یہ حقوق ٹکراتے تو نہیں؟

گر ٹکراتے ہوں تو قرآن مجید اس ٹکراؤ کو کیسے رفع کرتا ہے؟

وہ تمدنی یا عمرانی ضابطے جن کی احتیاج اجتماعی زندگی میں قیادت کو پیش آتی ہے ان کی نسبت قرآن مجید کیا معلومات مہیا کرتا ہے؟

مادی قدروں کی نسبت قرآن مجید کا نظریہ کیا ہے؟ خصوصاً اخلاقی قدروں کے مقابلے میں؟

کیا پیغمبرانہ راہ کو چھوڑ کر مفاد پرستی کی راہ پر چلنے والی انسانیت کے لئے قرآن مجید کے پاس کوئی ہدایت ہے؟

اس دور میں پیغمبرانہ راہ سے انحراف کرنے والی انسانیت میں کیا تاریخی اور معاشی تقاضے ابھرے ہیں؟

ارتقاء کی منطقی تدریج کے تحت حیات مرتقی میں کون سے مدارج متعین ہوتے ہیں؟

اور وہ مدارج اپنی اپنی جگہ کون سے تاریخی تقاضے رکھتے ہیں؟

ان تقاضوں نے ہماری عملی زندگی میں معیاری اسلام سے اس قدر بُعد کیوں پیدا کر دیا ہے؟

وہ کون سے مؤثرات ہیں جنہوں نے معیاری دین سے معمول بہ دین کو اس درجہ مختلف بنا دیا ہے کہ ہمارا اعتماد متزلزل ہو کر رہ گیا ہے؟

جب تک ان مسائل کا حل مہیا نہ کیا جائے، نوجوانوں کا اعتماد قوم کے مستقبل کی نسبت بحال ہو سکتا ہے نہ مناسب نصاب تیار ہو سکتا ہے، نہ پاکستان کی ترقی کی خاطر مذہبی اور اخلاقی، سیاسی اور معاشی، معاشرتی اور تعلیمی اعتبار سے جدوجہد کا کوئی رخ متعین ہو سکتا ہے۔

> ہو صداقت کے لیے جس دل میں مرنے کی تڑپ
> پہلے اپنے پیکرِ خاکی میں جاں پیدا کرے
> پھونک ڈالے یہ زمین و آسمان مستعار
> اور خاکستر سے اپنا جہاں پیدا کرے
> زندگی کی قوت پنہاں کو کر دے آشکار
> تا یہ چنگاری فروغِ جاوداں پیدا کرے
> خاکِ مشرق پر چمک جائے مثالِ آفتاب
> تا بدخشاں پھر وہی لعلِ گراں پیدا کرے
> سوئے گردوں نالۂ شب گیر کا بھیجے سفیر
> رات کے تاروں میں اپنے رازداں پیدا کرے
> یہ گھڑی محشر کی ہے تو عرصۂ محشر میں ہے
> پیش کر غافل عمل کوئی اگر دفتر میں ہے

شلوار اور پتلون کے پائنچوں کا شرعی حکم
ایک تحقیق

محمد عارف خان ساقی

لیکچرار شعبہ علوم اسلامی، جامعہ کراچی

ہمارے سامنے "بچوں کا اسلام" نامی رسالے کا ۲۲ دسمبر ۲۰۰۲ء کا شمارہ ہے۔ "خوفناک" کے زیر عنوان اس میں ایک مضمون طبع ہوا ہے۔ جو جنید زید صاحب کی تحریر ہے۔ مضمون نہایت پر اثر اور پر مغز ہے۔ ایک اہم شرعی مسئلے کو جو عرصے سے ہمارے عوام میں موضوع بحث ہے، کہانی کے انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ بہت مختصر مگر جامع۔ مضمون نگار نے اسے دلنشین اور ہمہ جہت بنانے کی پوری کوشش کی ہے اور بڑی حد تک اپنے اس مقصد میں وہ کامیاب بھی رہے ہیں۔ ہمیں اس لحاظ سے بھی یہ انداز اچھا لگا کہ مذہبی اور معاشرتی اقدار کا بار امانت نئی نسلوں کو منتقل کرنے کا آج یہی خوبصورت ترین طریقہ اور ذریعہ ہے۔ تاہم مضمون میں ایک سنگین غلطی بھی موجود ہے۔ مضمون نگار کا اس معاملے میں کوئی قصور بھی نہیں کہ انہوں نے تو وہی لکھا اور نئی نسل کو پہنچایا جو پچھلی نسل نے ان کو دیا تھا۔ اسی طرح اس نسل کو بھی ان کے اگلوں نے مسئلے کی نوعیت شاید یہی بتائی تھی۔ اس کی ہیئت کب بدلی اور مسلّمہ قوانین اور طے شدہ اصولوں کو اس معاملے میں کیوں پامال کیا گیا؟ کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ تاہم اتنا ضرور ہے کہ کھلے ذہن کے ساتھ شریعت کے

رہنما اصولوں کو قبول کرنے سے انحراف کرتے ہوئے محض دیکھا دیکھی کی روایت و ہٹ پر اڑے رہنا ہم میں سے کسی کے لیے بھی سود مند نہیں۔ اب بھی وقت ہے خالی الذہن ہو کر اسلامی تعلیمات کا بغور مطالعہ کیا جائے۔ پہلے سے تیار اور رواج پذیر نظریات اور رویوں کو قرآن و حدیث سے تحفظ مہیا کرنے کا بے سود تکلف نہ کیا جائے تو بات بن سکتی ہے۔ ممکن ہے پچھلوں کی روایت اور اپنی برسوں پرانی عادت کسی کے دل میں انا کا بیج ڈال دے۔ تبدیلی کو طبیعت گوارا نہ کر سکے۔ بقول اقبال

برائی نظر پیدا مگر مشکل سے ہوتی ہے
ہوس چھپ چھپ کے سینوں میں بنا لیتی ہے تصویریں

صورت حال اگر یہ رخ اپنا لیتی ہے تو اس نیکی کی حیثیت فریب نظر سے زیادہ کچھ نہیں رہے گی۔ یہ شیطانی دام ہم رنگ زمیں ہوگا۔ آدمی جس برائی سے بچنے کے لئے یہ ساری تگ و دو کر رہا ہے، عین اسی برائی میں جا پڑنے والی بات۔ حدیث ذیل پذرا اطمینان کے ساتھ غور کیجئے۔

حضور رسول اکرم ﷺ نے اس کے ذریعہ اپنی امت کو کیا پیغام دیا ہے:

ان رجلا اتی النبی ﷺ وکان رجلا جمیلا فقال یا رسول اللہ صلی اللہ علیک وسلم انی رجل حبب الی الجمال واعطیت منہ ماتراہ حتی ما احب ان یفوقنی احد اما قال بشراک نعلی واما قال بشسع نعلی افمن الکبر ذالک ؟ قال: لا! ولکن الکبر من بطر الحق وغمط الناس۔ (سنن ابی داؤد، کتاب اللباس، باب ماجاء فی الکبر)

ترجمہ: ایک آدمی نبی اکرم ﷺ کے پاس حاضر ہوا۔ وہ خود بھی خوبصورت آدمی تھا۔ تو کہنے لگا: یارسول اللہ ﷺ! خوبصورتی مجھے بیحد محبوب ہے اور آپ ﷺ ملاحظہ بھی فرما رہے ہیں کہ مجھے اس میں سے حصہ بھی خوب ملا ہے، یہاں تک کہ میں نہیں چاہتا کہ کوئی اور شخص جوتی کے تسمے کے برابر بھی مجھ سے برتر ہو جائے۔ آیا یہ تکبر ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا نہیں! تکبر تو یہ ہے کہ کوئی حق کے مقابلے میں اپنی ہٹ پر قائم رہے اور دوسرے لوگوں کو کمتر سمجھے۔

ترمذی کی روایت قدرے مختلف الفاظ کے ساتھ ہے اور آخر میں ہے

ان اللہ یحب الجمال ولکن الکبر من بطر الحق وغمص الناس
(جامع ترمذی، ابواب البر والصلۃ، باب ماجاء فی الکبر)

ترجمہ: طے شدہ بات ہے کہ اللہ تعالیٰ خوبصورتی کو پسند کرتا ہے۔ لیکن تکبر یہ ہے کہ کوئی حق کے مقابلے پر اڑا رہے اور لوگوں کو حقیر سمجھے۔

سعادت و نجات صرف شریعت کی پیروی میں ہے اور بے احتیاطی یا کسی معمولی غلطی کے نتیجے میں فروغ حاصل کر لینے والے افکار و خیالات شریعت کے رخ روشن کا حجاب ہو جاتے ہیں۔ اس طرح گوہر مقصود تو نظر سے اوجھل ہی ہو جاتا ہے اور سایوں کے تعاقب کی بے سود مشقت اور بے فیض ریت گلے پڑ جاتی ہے۔ بدقسمتی سے زیر بحث مسئلے میں بھی ہمارے انداز اب تک یہی کچھ رہے ہیں۔ بقول شاعر

جو جمال روئے حیات تھا جو دلیل راہ نجات تھا
اسی راہبر کے نقوش پا کو مسافروں نے مٹا دیا

آج یہ نظریات ایک وبا کی طرح پھیل چکے ہیں اور ہر مسجد میں نمازی حضرت اپنے ساتھی نمازیوں کو نماز شروع ہونے سے قبل اثنائے تکبیر میں اسی کی تلقین کرتے نظر آتے ہیں۔ گویا شریعت اور نماز کی صحت کا دارومدار اسی پر رہ گیا ہے۔

یا شلوار!

مضمون میں بحث کی شروعات اس جملے سے ہو رہی ہے: "جب بھی آپ کو دیکھا آپ کی شلوار ہمیشہ ٹخنوں سے نیچی نظر آئی"۔ پھر اپنے سامع یا قاری کو خوف میں مبتلا کرنے کے لئے یہ جملہ کتنا بھاری بھرکم ہے۔ "اور مشکل یہ ہے کہ کوئی معمولی گناہ نہیں جس کی طرف توجہ دینے کی ضرورت ہی نہ ہو، یہ بہت خوفناک گناہ ہے"۔ اگلی سطور میں یہ تک صراحت کر دی گئی کہ "کوئی غرور سے لٹکائے یا بغیر غرور کے یہ کبیرہ گناہ ہے"۔

یہ زہر کس خاموشی سے اور کیسے دھیرے دھیرے رگوں میں اترتا رہا اور سرایت کرتا رہا یوں اندازہ کیجئے کہ بطور دلیل پیش کی گئی پہلی حدیث میں جہاں صرف تہبند کا ذکر تھا، حدیث کا ترجمہ بدل کر یوں کر دیا گیا: "پھر آپ ﷺ نے فرمایا تہبند یا شلوار وغیرہ کو ٹخنوں سے نیچے لٹکانے والا"۔

یہاں "یا شلوار وغیرہ" کے اضافے کو ہم اعتیاداً تحریف تو نہیں کہتے۔ البتہ یہ مغالطہ آرائی یا کم از کم غلط فہمی ضرور ہے۔ حدیث میں اس طرح کے اضافے کسی بھی طرح روا قرار نہیں دیئے جا سکتے۔ اہل علم پر مخفی نہیں کہ واحد متفق علیہ متواتر حدیث کا تعلق اسی باب سے ہے۔ ہم کسی بھی مسلمان کے بارے میں یہ گمان تک نہیں کر سکتے کہ وہ دیدہ دلیری کے ساتھ حضور اکرم ﷺ کی طرف کوئی ایسی بات منسوب کرے گا جو آپ ﷺ نے کہی ہی نہ ہو اور یوں اپنے آپ کو حدیث متواتر میں وارد وعید کی زد میں جھونک دے گا۔ آپ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

من كذب علي متعمدا فليتبوأ مقعده من النار.

(صحیح بخاری، جلد اول، کتاب العلم، باب اثم من کذب علی النبی ﷺ و صحیح مسلم، مقدمہ، باب تغلیظ الکذب علی رسول اللہ ﷺ)

ترجمہ: جس نے جان بوجھ کر جھوٹی بات مجھ سے منسوب کی وہ جہنم میں اپنے ٹھکانے کی تیاری کر لے۔

چنانچہ غیر ارادی طور پر ہی سہی بہر حال اب کانٹا تو تبدیل ہو گیا ہے۔ لہٰذا اگلی احادیث میں کام قدرے آسان ہو گیا ہے۔ کہیں "تہبند وغیرہ" کہیں "کپڑے" اور کہیں "لباس" کہہ کر غلط پٹری پہ ڈالی گئی اور اب غلاظت میں رواں دواں ٹرین کے سارے سگنل کلیئر کر دیئے گئے۔ ازیں بعد اس گناہ کو گیارہ گناہوں کا مجموعہ قرار دیا گیا ہے۔ جن میں سے ایک "واضح احادیث کا انکار" ہے۔ اسی طرح یہ بھی ایک ہے کہ یہ کافروں، مغروروں اور گناہ گاروں سے مشابہت ہے۔ الامان والحفیظ۔

یہ واضح رہے کہ یہ عمل مسلمانوں کے کسی خاص مکتبہ فکر، طبقے یا گروہ کی علامت یا امتیاز نہیں ہے۔ بلکہ بلا امتیاز بہت سے سادہ لوح لوگ اس علت میں مبتلا ہو گئے ہیں۔ سب سے زیادہ تکلیف دہ امر یہ ہے کہ ارباب فضل و کمال میں سے کچھ تو اسی دھارے میں بہہ رہے ہیں باقی مکمل خاموش۔ ممکن ہے کہ آج بھی کسی کو "عموم بلویٰ" کا اندیشہ چپ رکھے ہوئے ہو۔ یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ ہمارا پیش نظر مقصد متذکرہ مضمون کا جواب لکھنا ہرگز نہیں۔ صرف گرد جھاڑنا اور صحیح شرعی حکم کی اصل ہیئت کو واضح اور بحال کرنا ہے۔

عہد رسالت میں لباس کی نوعیتیں

نفس مسئلہ کی وضاحت سے پہلے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ لباس کے کم سے کم ان پہلوؤں کے حوالے سے عہد رسالت علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے طور طریقوں اور رسوم و رواج پر ایک سرسری نظر ڈال لی جائے جن کا ہمارے موضوع سے براہ راست تعلق ہے۔ زیریں جامہ کے طور پر عہد اقدس میں دو طرح کے لباس تھے۔ ایک سروال کہلاتا، جبکہ دوسرا ازار کے نام سے موسوم تھا۔ سروال، شلوار اور پاجامے کو کہتے ہیں۔ یہ عرب ثقافت پر ہندی اثرات کی قدیم علامات اور نشانیوں میں سے ایک ہے۔ غالب گمان یہی ہے کہ پہلے پہل عہد اقدس سے بھی بہت پہلے، ہندوستان آنے والے تاجروں نے اسے اپنایا اور پہنا۔ یہ اہل ہند کی مقامی موسمی ضرورتوں کو بھی پورا کرتا ہے اور ستر و لباس کی ضرورت بھی اس سے من احسن الوجوہ پوری ہو رہی تھی۔ مزید برآں خطرات کم سے کم تھے۔ یہی کچھ وجوہات رہی ہوں گی کہ عرب تجارتی قافلوں نے نہ صرف اسے عرب پہنچایا بلکہ عہد رسالت تک عرب ثقافت میں یہ اپنا مقام پیدا کر چکا تھا۔ نام کے معاملے میں بھی عربوں نے اس کے ساتھ خاصا روادارانہ برتاؤ کیا اور اس کے ہندی نام "سلوار" جسے آج ہم ش کے ساتھ شلوار کہتے ہیں، ہی کو حروف کے معمولی ہیر پھیر کے ساتھ سروال بنایا اور اس کے نام کر دیا۔ معروف محقق و تاریخ نگار ڈاکٹر حمید الدین عربوں کے تہذیب و تمدن پر بیرونی اثرات کا جائزہ لیتے ہوئے لکھتے ہیں:

"کئی چیزوں مثلاً سکہ، چراغ، کوزہ، پاجامہ وغیرہ کے لیے ان کی اپنی زبان میں الفاظ نہیں تھے"۔

(تاریخ اسلام، باب اول، تمدنی حالت، صفحہ ۴، فیروز سنز۔ لاہور)

معروف سیرت نگار و محقق علامہ شبلی نعمانی فرماتے ہیں:

"پائجامہ کو سروال کہتے ہیں جو شلوار کی بگڑی ہوئی صورت ہے" (سیرت النبی، جلد اول، تاریخ عرب قبل اسلام، تہذیب و تمدن، صفحہ ۸۰، دارالاشاعت۔ کراچی)

اس سے صاف عیاں ہے کہ عرب معاشرہ عہد جاہلیت کے طور طریقوں سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لئے مسلسل ہاتھ پاؤں مارتا رہا۔ دیگر تمام ترقی پذیر معاشروں کی طرح عہد رسالت سے قبل بھی مدت مدید تک تبدیلیوں کی زد میں رہتے ہوئے تہذیب و تمدن کی جانب اس

کی پیش قدمی جاری رہی۔ خانہ بدوش قبائل بھی تہذیب و تمدن کی اعلیٰ اور منظم اقدار سے بتدریج متاثر ہوتے رہے۔

تبدیلی کی اس لہر نے عربوں کے رہن سہن کے اطوار، لباس، طرز تعمیر اور زبان سمیت ہر شعبۂ زندگی کو متاثر کیا۔ اسلام کی آمد اور ستر پوشی کی غیر معمولی اہمیت کی وضاحت کے بعد زندگی کے تمام شعبوں میں سرگرم تبدیلیوں کی لہر میں بالعموم اور لباس کے معاملے میں پاجامے کی اہمیت و مقبولیت میں بالخصوص بے پناہ اضافہ ہو گیا۔ عہد رسالت میں ہی شرفاء اور معززین تک اسے زیب تن کرنے لگے تھے۔

کوئی بھی معاشرہ نہ تو چٹکی بجاتے میں اپنی کسی دیرینہ روایت کو ترک کر سکتا ہے اور نہ ہی کسی نئی روایت کو اپنا سکتا ہے۔ تجربات جب تحفظات کو غلط ثابت کر دیتے ہیں تو نئی روایت سے وابستگی باعث خطر و عار نہیں رہتی۔ نہ ہی اپنی تہذیبی و ثقافتی اقدار سے بغاوت شمار ہوتی ہے۔ یہ ماحول اور موسم نئی روایت کی بہتر نشو ونما کے لئے سازگار حالات پیدا کر دیتے ہیں۔ نو وارد روایت سے اجنبیت کا رجحان کمزور ہو جاتا ہے اور اسے اپنانے والوں کی تعداد میں اضافہ روز افزوں ہو جاتا ہے۔ خصوصاً جبکہ وابستگی باعث عار نہ رہے تو آخری رکاوٹ بھی تبدیلی کی لہر کے آگے سرنگوں ہو جاتی ہے۔

ذرا ماضی کے جھروکوں میں جھانکیے! ماضی قریب میں ہمیں بھی اس نوع کی ایک تبدیلی کا سامنا رہا ہے۔ یہاں شلوار اور پتلون باہم مد مقابل تھے۔ ہم نے اپنے لوگوں کی پتلون سے نفرت و بیگانگی کو بھی اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب یہ خالص انگریز وضع اور سامراج کی علامت شمار ہوتی تھی۔ اور مفتوح قوم اپنے غیر ملکی حکمرانوں سے نفرت کے اظہار کے لیے اپنے سپوتوں کو ان کی وضع قطع اپنانے سے دور رکھنے اور بچانے کے لیے سرگرم اور فکر مند تھی۔ ہوتے ہوتے آج یہ ہر گھر کے نوجوانوں کا مقبول ترین لباس ہے۔

فرمان رسول اکرم ﷺ: من تشبہ بقوم فھو منھم

(ابو داؤد، حصہ دوم، کتاب اللباس، باب ماجاء فی الاقبیہ، صفحہ ۲۰۳، مکتبہ حقانیہ، ملتان)

ترجمہ: جو شخص دانستہ کسی اور قوم کے افراد سا دکھنا چاہے گا، وہ انہی میں شمار ہوگا۔

ادھر عرصے تک زبان زد خاص و عام رہا۔ ادھر پتلون کا نفوذ و رسوخ بھی بڑھتا رہا۔ حرمت، کراہت تحریمی، کراہت تنزیہی، جواز اور قبولیت یا اس کے سفر کے اہم مرحلے تھے۔ اب تو ہر کوئی اپنا سا لگنے کی کوشش میں ہے یا زیادہ سے زیادہ اپنوں سا، غیروں کی سی اب وہ بات کہاں؟ ہم تو یوں بھی پتلون کے مداح ہیں کہ اس کے باعث طویل عرصے تک خواص تو کیا عامیوں کو بھی محولہ بالا فرمان رسالت مآب ﷺ ازبر رہا۔ رہا معاملہ شلوار کا تو اسے خراج تحسین پیش نہ کرنا بھی بڑا بخل ہوگا کہ مقابلہ تو دل ناتواں نے خوب کیا۔

ایسے آثار اور شواہد بہت ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ عہد رسالت میں ہی پاجامے کا رواج عام ہو چلا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ سامنے کی ایسی چیز جسے ہر کوئی کھلی آنکھوں سے دیکھ سکتا ہو، کا لفظوں میں تذکرہ کوئی نہیں کرتا۔ کرتا بھی ہے تو بالتبع اور کسی دوسرے حوالے سے۔ جبکہ تاریخ لفظی شہادت کو زیادہ ٹھوس خیال کرتی ہے۔ ایسے میں یہ فرض کر لینا کہ کچھ تھا یا ہوا ہی نہیں بے معنی سی حرکت ہے۔ لہٰذا ہمیں یہ کہنے میں کچھ باک نہیں کہ کم سے کم بعض کبار صحابہ کرام نے سروال کو اپنے لباس کا حصہ بنا لیا تھا۔ امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ اپنی مسند میں روایت کرتے ہیں:

عن نعیم المجمر انہ قال رقیت مع ابی ھریرۃ علی ظھر المسجد وعلیہ سراویل من تحت قمیصہ فنزع سراویلہ ثم توضأ وغسل وجھہ ویدیہ ورفع فی عضدیہ الوضوء ورجلیہ فرفع فی ساقیہ ثم قال انی سمعت رسول اللہ ﷺ یقول، ان امتی یأتون یوم القیمۃ غرا محجلین من اثار الوضوء فمن استطاع منکم ان یطیل غرتہ فلیفعل۔ (مسند احمد بن حنبل، جلد ۳، صفحہ ۱۱۳، احیاء التراث العربی، بیروت)

ترجمہ: نعیم المجمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے۔ کہتے ہیں کہ میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ساتھ مسجد کی چھت پر گیا۔ آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنی قمیص کے نیچے پاجامہ زیب تن فرما رکھا تھا۔۔ آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اسے ہٹایا پھر وضو کیا اور اپنا چہرہ اور دونوں ہاتھ دھوئے اور بازوؤں میں اوپر تک پانی بہایا۔ پاؤں کی باری آئی تو پنڈلیوں میں اوپر تک پانی پہنچایا۔ پھر فرمایا: میں نے رسول اکرم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ میری امت قیامت کے

روز اس حال میں آئے گی کہ ان کے اعضائے وضو روشن و تابناک ہو نگے۔ تو تم میں سے جو بھی اپنے تابناک اعضاء کا حصہ زیادہ کرنا چاہے کر لے۔

یہ اور اسطرح کی متعدد دیگر احادیث و آثار میں صراحتیں موجود ہیں کہ کبار صحابہ کرام اسے زیب تن فرمانے لگے تھے۔ اور مقتدر و محترم شخصیات جب کسی لباس کو اپنالیں تو معاشرے کے عام افراد بھی اپنی قدیمی روایت اور وضع بدلنے پر مجبور ہو جایا کرتے ہیں۔ خوف طوالت سے ہم ان تمام احادیث میں سے بطور اشارہ محض اسی ایک پر اکتفا کرتے ہوئے پہلی صدی ہجری کے اختتام پر خلیفۂ وقت کے لباس کی بات کرتے ہیں۔ رسالہ قشیریہ میں امام ابو القاسم عبد الکریم بن ہوازن قشیری خشوع و خضوع کے باب میں لکھتے ہیں:

وحكى عن رجاء ابن حيوه انه قال: قومت ثياب عمر بن عبدالعزيز وهو يخطب باثنى عشر درهما ، وكانت قباء ، وعمامة و قميصا و سراويل وخفين وقلنسوة. (الرسالۃ القشیریہ، باب الخشوع والتواضع، الصفحہ ۱۸۷، دار الکتب العلمیہ، بیروت، اردو ترجمہ از پیر محمد حسن، صفحہ ۳۲۷، ادارہ تحقیقات اسلامی۔ اسلام آباد)

رجاء بن حیوۃ سے حکایت کی گئی ہے کہ عمر بن عبد العزیز رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے لباس کی قیمت لگائی گئی، جس کو پہنے ہوئے آپ خطبہ دے رہے تھے، تو اس کی قیمت بارہ درہم گی۔ آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے لباس میں یہ چیزیں شامل تھیں: چوغہ، پگڑی، قمیص، شلوار، چادر، دو موزے اور ایک ٹوپی۔

عرب دھیرے دھیرے اس کی طرف رغبت و میلان کی لگامیں ڈھیلی چھوڑتے گئے اور رفتہ رفتہ یہ مقامی قدیمی لباس ازار سے بھی زیادہ پسند کیا جانے لگا۔ معززین، امراء و رؤساء اور اصحاب فضل و کمال بھی تہبند کے مقابلے میں اسی کو ترجیح دینے لگے۔ عہد اقدس تک عرب کے مقامی لباس کے مقابلے میں گو زیادہ مقبول اور مروج نہ تھا مگر عہد اقدس کے بعد کے ایام میں اس کی مقبولیت میں روز افزوں اضافہ ہی ہوتا چلا گیا۔ ہوتے ہوتے عرب ثقافت کا اب یہ ایک لازمی جز بن گیا ہے۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ کمال ستر پوشی کے معاملے میں ضرورت اور

شریعت دونوں کے ساتھ خاصا ہم آہنگ ہے۔

آیا آپ ﷺ نے پاجامہ زیب تن فرمایا:

آیئے! ایک اور سوال کے جواب کی جستجو کرنے کے لئے ہم عہد رسالت مآب علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام میں واپس چلتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ کیا سروال یعنی شلوار یا پاجامے کو حضور اکرم ﷺ نے بھی کبھی زیب تن فرمایا؟

جواب علامہ شبلی نعمانی کے الفاظ ملاحظہ فرمائیں۔ آپ ﷺ کے لباس مبارک کے حوالے سے رقمطراز ہیں: "لباس کے متعلق کسی قسم کا التزام نہ تھا عام لباس چادر قمیص اور تہبند تھی۔ پاجامہ کبھی استعمال نہیں فرمایا۔ لیکن امام احمد اور اصحاب سنن اربعہ نے روایت کی ہے کہ آپ ﷺ نے منیٰ کے بازار میں پاجامہ خرید ا تھا۔ حافظ ابن قیم نے لکھا ہے کہ اس سے قیاس ہوتا ہے کہ استعمال بھی فرمایا ہوگا۔" (سیرت النبی، جلد دوم، شمائل، لباس، صفحہ ۱۲۵، دار الاشاعت۔ کراچی)

ابن قیم کے قول کا جائزہ

حافظ ابن قیم کا قیاس بوجوہ درست ہے کہ آپ کے پاجامہ خریدنے کی روایت اصحاب حدیث وار باب شمائل کی بیان کردہ نہیں۔ بلکہ اسی بزاز نے، جس سے آپ نے خرید ا تھا، آپ کی تشریف آوری، شرف ملاقات اور آپ ﷺ کو پہچان لینے کے حوالے سے بات کرتے ہوئے بالتبع تشریف آوری کا سبب بھی خریداری ظاہر کیا ہے۔ پاجامے کی خریداری کا بیان ان کا مطمح نظر نہ تھا۔ روایت کے الفاظ پر غور فرمایئے:

عن سويد بن قيس قال: جلبت انا و مخرمة العبدى بزامن البحرين الى مكة ، فاتانا رسول ﷺ يمشى ، فساومنا بسراويل اواشترى منا سراويل و ثم وزان يزن بالاجر ، فقال للوزان: "زن وارجح" فلما ذهب يمشى قالوا هذا رسول الله ﷺ ۔ (سنن دارمی، جزء ثانی، کتاب البیوع، باب الرجحان فی الوزن، صفحہ ۱۷۵، نشر السنہ، ملتان)

ترجمہ: حضرت سوید بن قیس سے روایت ہے۔ فرماتے ہیں: میں اور مخرمہ العبدی بحرین سے کچھ بزازی مال لیکر آئے تو رسول ﷺ چلتے ہوئے ہمارے پاس تشریف لائے۔ آپ ﷺ نے ہم سے

ایک پاجامے کے دام کئے یا (یوں کہا کہ) ہم سے پاجامہ خریدا۔ ہمارے یہاں ایک وزن کرنے والا مزدور تھا تو آپ ﷺ نے اس سے فرمایا: "تولو اور بڑھتا ہوا تولو"۔ جب آپ ﷺ واپس چلے گئے تو سب نے کہا: آپ رسول خدا ﷺ ہیں۔

اصحاب سنن اربعہ نے بھی اس حدیث کو روایت کیا ہے۔ امام ترمذی کی روایت میں بحرین کی جگہ "ھجر" کا لفظ ہے اور بلا شک راوی "فرأوحنا" کی صراحت ہے۔ مزید برآں امام ترمذی نے اس حدیث کو صحیح قرار دیا ہے۔ (دیکھئے: ابواب البیوع، باب ماجاء فی رجحان الوزن)

عدم صراحت عدم وقوع کی دلیل نہیں

آپ نے خریداری بھی اعلان نبوت کے بعد فرمائی۔ جس سے پتا چلتا ہے کہ ارباب سیر واحادیث اس معاملے میں مکمل خاموش ہیں کہ آپ ﷺ نے کب اور کس کس وضع کے لباس زیب تن فرمائے۔ اس میں بھی اس پاجامے کا معاملہ نمایاں ہے۔ ہم اوپر اس اصول کا سرسری ذکر کر آئے ہیں کہ سامنے کی چیز کو لفظوں میں اصالۃً بیان کیا نہیں جاتا۔ وہ صورت اور ہوتی ہے جسے آج ہم خبر نگاری کہتے ہیں۔ عہد اقدس میں ایسا کوئی دستور نہیں تھا۔ نتیجہ یہ کہ عدم بیان عدم وقوع کے اثبات کے لئے سازگار دلیل ہو نہیں سکتی۔ مزید برآں یہ تو طے ہے کہ آپ ﷺ نے پاجامہ خریدا تھا۔ آیا بغرض خیاط خریدا تھا؟ یہ تو قیاس وگمان کی حدوں سے باہر ہے۔ تو پھر یہ بحث بالکل فضول ہوگی کہ آپ نے خود زیب تن فرمایا یا نہیں؟ اس لئے کہ آپ نے کسی اور کو پہننے کے لیے عطا فرمایا ہوگا تب بھی امر و ترغیب ہے۔ اور آپ ﷺ کے فعل پر آپ ﷺ کے قول کو مسلمہ امر ہے کہ ترجیح اور فوقیت حاصل ہے۔

اس لحاظ سے بھی پاجامہ عہد اقدس کا مسنون، مروج اور مقبول اسلامی لباس قرار پاتا ہے۔

پاجامے سے متعلق چند دیگر احکام

یہ طے کرنا ابھی باقی ہے کہ اسلامی تعلیمات کو عام کرتے اور امور شرعیہ کو بیان کرتے وقت آپ ﷺ نے آیا شلوار کے حوالے سے بھی کوئی حکم بیان بھی فرمایا یا کلی طور پر اسے نظر انداز ہی فرمایا؟ امام احمد بن حنبل ہی کی ایک اور روایت ملاحظہ فرمائیے:

عن ابن عمر ان رجلا سأل رسول الله ﷺ ما نلبس اذا احرمنا ؟ قال: لا تلبسوا القمص ولا السراويلات ولا العمائم ولا البرانس ولا الخفاف الا ان يكون رجلا ليست له نعلان فليلبس الخفين ويجعلهما اسفل من الكعبين ولا تلبسوا شيئا من الثياب مسه الزعفران ولا الورس. (مسند احمد، جلد دوم صفحہ ۱۹۵۔ بیروت۔ وصحیح مسلم، جلد اول، کتاب الحج، باب ما یباح للمحرم، صفحہ ۳۷۲، قدیمی۔ کراچی وسنن دارمی، جلد اول، باب ما یلبس المحرم من الثیاب، صفحہ ۳۶۳ نشر السنۃ۔ ملتان وصحیح بخاری، کتاب اللباس، باب السراویل)

ترجمہ: حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا: احرام پہن لینے کے بعد ہم کیا کچھ پہن سکتے ہیں؟ آپ نے فرمایا: قمیص، شلواریں، پگڑیاں اور ٹوپیاں مت پہنو اور نہ موزے۔ البتہ اگر کسی کے پاس جوتے نہ ہوں تو موزے ہی پہن لے مگر ان کو ٹخنوں سے نیچا رکھے اسی طرح زعفران اور ورس (رنگ وخوشبو) لگا کپڑا بھی حالت احرام میں مت پہنو۔

امام مسلم بن الحجاج القشیری کی ایک اور روایت ملاحظہ فرمائیے:

عن ابن عباس قال سمعت رسول الله ﷺ وهو يخطب يقول: السراويل لمن لم يجد الازار والخفان لمن لم يجد النعلين يعني المحرم۔ (مسلم شریف، جلد اول، کتاب الحج، صفحہ ۳۷۲، قدیمی کتاب خانہ کراچی اور اصحاب ستہ میں سے باقی نے بھی اس حدیث کو ملتے جلتے الفاظ کے ساتھ روایت کیا ہے)

ترجمہ: حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے فرماتے ہیں: میں نے رسول اکرم ﷺ کو خطبہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا۔ جس محرم کو تہبند میسر نہ ہو پاجامہ پہن لے اور جسے جوتے دستیاب نہ ہوں وہ موزے ہی پہن لے۔

یہ واضح رہے کہ حالت احرام میں سلے ہوئے کپڑے پہننا ممنوع ہیں۔ صرف ازار اور چادر ہی روا اور مشروع ہیں۔ علامہ نووی نے اس لباس کی ایک حکمت یہ بھی بیان فرمائی ہے کہ: وليتذكر به الموت ولباس الاكفان (شرح صحیح مسلم، جلد اول، کتاب الحج، صفحہ

۲۷۲، قدیمی کتب خانہ۔ کراچی)

ترجمہ: اور اس لئے بھی کہ محرم اپنی موت اور لباس کفن کو بھی دھیان میں رکھ کر چلے۔

کیونکہ مرنے کے بعد ایسی ہی ان سلی چادروں میں لپیٹ کرا سے سفر آخرت پہ نکلنا ہے۔ مزید برآں پہلی حدیث میں بیان کردہ حکم کا اطلاق اس صورت پر ہے کہ تہبند دستیاب ہو جبکہ دوسری حدیث میں تہبند کی عدم دستیابی کی صورت کا صراحت کے ساتھ ذکر ہے۔ لہٰذا کسی کا ذہن اس طرف نہ جائے کہ دونوں احادیث باہم معارض ہیں۔ ان احادیث مبارکہ سے یہ امر پوری طرح واضح ہے کہ جہاں ضرورت شرعی آپ ﷺ نے محسوس فرمائی شلوار یعنی پاجامے کا ذکر بھی فرمایا۔ اس سے متعلقہ احکام شرعیہ پر نصوص احادیث بصراحت وارد ہیں تو اسے عہد اقدس کی بھول بسری چیز خیال کرنا ایک سنگین غلطی کے سوا کچھ بھی نہیں۔ امام المحدثین محمد بن اسماعیل بخاری رحمتہ اللہ تعالیٰ علیہ کی ایک اور روایت ملاحظہ فرمائیں:

عن ابی هریرة قال قام رجل الی النبی ﷺ فسأله عن الصلوة فی الثوب الواحد فقال او کلکم یجد ثوبین ؟ ثم سأل رجل عمر رضی الله تعالی عنه فقال اذا وسّع الله فاوسعوا اجمع رجل علیه ثیابه صلی رجل فی ازار ورداء، فی ازار و قمیص، فی ازار و قباء، فی سراویل ورداء، فی سراویل و قمیص، فی سراویل و قباء، فی تبان و قباء، فی تبان و قمیص، قال واحسبه قال فی تبان ورداء۔ (بخاری شریف، کتاب الصلوۃ، باب الصلوۃ فی القمیص والسراویل)

ترجمہ: حضرت ابوہریرۃ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے۔ فرماتے ہیں کہ ایک شخص نبی کریم ﷺ کے پاس آیا اور ایک ہی کپڑے میں نماز کی ادائیگی کا مسئلہ دریافت کیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: آیا تم میں سے ہر ایک کو دو کپڑے تو مل سکتے ہیں؟ پھر ایک شخص نے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے پوچھا۔ آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: جب اللہ تعالیٰ نے کشائش و فراوانی بخشی ہے تو اس کا اظہار بھی کرو۔ آدمی اپنے لیے اپنے کپڑے یکجا کرے۔ کوئی تہبند اور چادر میں نماز پڑھے، تہبند اور قمیص میں کوئی ادا کرے، کوئی تہبند اور قبا میں، پاجامے اور چادر میں، پاجامے اور قمیص میں،

پاجامے اور قبا میں، جانگیے اور قبا میں یا جانگیے اور قمیص میں نماز ادا کرے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں: میرا خیال ہے کہ انہوں نے جانگیے اور چادر کا بھی ذکر فرمایا تھا۔

یہ تمام احادیث اس امر کا واضح ثبوت ہیں کہ شلوار سے متعلقہ جن شرعی امور و مسائل کی حاجت تھی، بیان کر دیے گئے۔ لہٰذا شلوار کو ان اشیاء کی فہرست میں شامل نہیں کیا جا سکتا جن کے معاملے میں شارع علیہ السلام نے مکمل سکوت فرمایا اور امت کی صوابدید پر رہنے دیا۔ یا جن اشیاء کا عہد رسالت علی صاحبہا الصلوۃ والسلام میں وجود ہی نہ تھا یا وجود تو تھا مگر حضور رسالتمآب ﷺ کے سامنے نہ آئیں اور آئمہ مجتہدین نے رہنما اصولوں پر غور و خوض کے ذریعے ان کا شرعی حکم دریافت یا طے کیا۔

کھلے پائنچے

یہاں یہ چیز بھی قابل لحاظ ہے کہ کبھی کبھی لباس کے انداز بدل بھی جاتے ہیں۔ کچھ عرصہ پہلے کی ہی بات ہے بہت کھلے کھلے پائنچے زینت اور فیشن کا حصہ رہے ہیں۔ البتہ اس قسم کی تبدیلیاں جو شلوار کی ہیئت کذائیہ اور اصلی وضع کو متاثر کرتی ہیں، زیادہ دیرپا نہیں ہوتیں۔ تاہم اتنا کھلا پائنچہ کہ چلتے وقت کبھی آگے کبھی پیچھے جھول کھاتا پھرے اور پنڈلی یا جسم کے ساتھ لگا ہوا اور تابع نہ رہے یا جس پائنچے سے پہننے والے کا کھڑا پنچہ بے روک آجا سکے گو کہ مسئلہ غیر منصوص علیہ ہے تاہم یہ ہیئت شلوار و تہبند کے بین بین نظر آتی ہے۔ اس وضع کی شلوار پہننے والے افراد کے حق میں بطور احتیاط کہا جائے گا کہ ایسا لباس پہننے سے بچیں یا پائنچے کو زمین تک نہ پہنچنے دیں۔

علامہ شامی نے فتاویٰ عتابیہ کے حوالے سے لکھا ہے:

"ویکره للرجال السراویل التی تقع علی ظهر القدمین"

(فتاویٰ شامی، جلد پنجم، کتاب الحظر والاباحۃ، فصل فی اللبس، صفحہ ۲۴۲، مکتبہ رشیدیہ، کوئٹہ)

ترجمہ: مردوں کے لئے ایسی شلواریں پہننا مکروہ ہیں جس کے پائنچے قدموں پر پڑتے ہوں۔

اور فتاویٰ عالمگیری میں یہی بات قدرے وضاحت سے بیان ہوئی ہے۔ ذرا مختلف الفاظ کے ساتھ عتابیہ ہی کے حوالے سے لکھا ہے:

"ویکره للرجل لبس السراویل المخرفجة وهی التی تقع علی

ظہر القدمین"۔ (فتاویٰ عالمگیری، جلد پنجم، کتاب الکراھیۃ، الباب التاسع فی اللبس وما یکرہ من ذلک، صفحہ ۳۳۳، مکتبہ رشیدیہ، کوئٹہ)

ترجمہ: ایسی کھلی شلواریں جن کے پائنچے پاؤں کی پشت پر جا پڑتے ہوں مردوں کے لئے مکروہ ہیں۔

یہاں کھلی شلواریں پہننا مطلق مکروہ قرار دیا گیا۔ مکروہ، مرغوب و پسندیدہ کی ضد ہے۔ کبھی اس کا اطلاق حرام پر ہوتا ہے کبھی مکروہ تحریمی پر اور کبھی مکروہ تنزیہی کے لئے بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ یہاں کسی کو یہ غلط فہمی نہ ہو کہ پھر ایسی شلواریں پہننا مکروہ تحریمی ہوگا۔ مکروہ تحریمی حرام کے قریب تر ہوتا ہے اور من مانے طور پر کسی بھی چیز کو مکروہ تحریمی قرار نہیں دیا جا سکتا۔ جب تک کہ کسی مضبوط دلیل شرعی کی تائید حاصل نہ ہو۔ ایسا موقف اپنا لینا حق پرستی کی کوئی شکل نہیں۔ مضبوط اور موثر دلیل سے مراد کم سے کم بھی ظنی ہے۔ یہ بھی طے شدہ امر ہے کہ اس حوالے سے کسی کے پاس کوئی دلیل شرعی ہے نہیں۔ لہٰذا مکروہ تنزیہی سے زیادہ اس کی حیثیت نہیں ہو سکتی۔ اب اہل علم مکروہ تنزیہی کا حال بھی خوب جانتے ہیں۔

تہمد

عہد رسالت علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام میں شلوار کے مقابل تہمد (تہبند) پہننے کا رواج بھی تھا۔ بلکہ شلوار کے مقابلے میں یہ زیادہ عام تھا۔ یہ عربوں کا اپنا قدیمی لباس تھا اور "ازار" کے نام سے موسوم تھا۔ آپ ﷺ کا عام معمول اسی کو زیب تن فرمانا تھا۔ جب آپ ﷺ نے وصال فرمایا تو اس وقت آپ نے اسی کو زینت بخش رکھی تھی۔ صحیحین کی روایت ہے:

عن ابی بردۃ اخرجت الینا عائشۃ کساء ملبدا و ازارا غلیظاً فقالت قبض روح رسول اللہ ﷺ فی ھذین (بحوالہ مشکوٰۃ شریف، جلد دوم، کتاب اللباس، حدیث ثالث)

ترجمہ: حضرت ابو بردہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے۔ فرماتے ہیں: حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے ہمیں ایک پیوند دار کپڑا اور ایک موٹا تہمد نکال کر دکھایا اور فرمایا: رسول اکرم ﷺ نے ان دو کپڑوں میں وصال فرمایا تھا۔

ازار یا تہمد کا معاملہ پاجامے یا شلوار سے خاصا مختلف تھا۔ یہ چونکہ عربوں کا اپنا اور قدیم وضع کے لباس کا حصہ تھا، اس لئے مقامی تہذیبی و ثقافتی اقدار میں گندھا ہوا اور کیوں کے لیے کئی یادوں کا امین اور محافظ بھی تھا۔ جب معاشرے میں کسی روایت کی جڑیں اس قدر گہری ہوں تو عقلی تخیلی استدلال کی حاجت ہی رہتی ہے نہ کسی مدد و تائید یا کسی حمایت کی ضرورت ہی پڑتی ہے۔ ایسی روایت آپ ہی آپ اپنی بقاء کا ساماں کر لیتی ہے۔ ایسی جمی جمی ہوئی روایت سے مقابلہ تھا شلوار کا۔

جاہلی رجحانات

تہمد کے بارے میں عہد جاہلیت میں ہی دو طرح کے رجحانات جنم لے چکے تھے۔ خوشحالی اور فارغ البالی نے عرب نوجوانوں کو جب عیش و عشرت اور زیبائش و نمائش کی طرف راغب کیا تو منچلے البیلیا سے لے اڑے۔ عربوں کے تجارتی قافلے نہایت قیمتی اور نفیس قسم کی ریشمی چادریں اپنے ساتھ لاتے تھے۔ یمن کی چادریں تو عہد رسالت میں بھی خاصی مقبول رہی ہیں۔ چنانچہ نہایت عمدہ اور نفیس چادریں بطور تہمد استعمال کرتے اور غرور و نخوت اور شان بے نیازی کے اظہار کے لئے لمبے لمبے پیچھے گھسٹنے کے لیے چھوڑ دیتے۔ ایسے کچھ مناظر و مظاہر آج بھی پاکستان کے کچھ دیہی علاقوں میں لاچے کی شکل میں دیکھنے کو مل سکتے ہیں۔ بلکہ بعض لوک فنکار اپنے فن کے مظاہرے کے دوران کبھی کبھار تو بالکل اسی ڈھب اور وضع قطع کا مظاہرہ کرتے ہیں جو چودہ صدی پہلے کے عرب نوجوانوں کا مشغلہ رہا ہے۔ گویا

آغاز جوانی ہے ذرا جھوم کے چلتے ہیں
دنیا یہ سمجھتی ہے ہم پی کے چلتے ہیں

عمرو بن قمیئہ کے اشعار

عرب شاعروں نے بھی اپنے کلام میں اس انداز تفاخر کو اہمیت اور جگہ دی ہے۔ عہد جاہلیت کے قدیم شعراء میں سے عمرو بن قمیئہ کے اشعار میں اس رجحان کو ملاحظہ کیجئے:

یا لہف نفسی علی الشباب ولم
افقد بہ اذ فقدتہ امما

اذا اسحب الريط والمروط الى

ادنى تجاري وانفض اللمما

لا تغبط المرء ان يقال له

امسى فلان لسنه حكما

ان سره طول عمره فلقد

اضحى على الوجه طول ما سلما

(دیوان الحماسۃ، باب الادب، صفحہ ۳۰۲، المکتبۃ السلفیہ، لاہور)

ترجمہ:

جوانی پر ہائے مجھے دلی افسوس ہے۔ اور بات یہ ہے کہ جب میں نے اسے کھویا تو کوئی معمولی چیز نہیں کھوئی۔

جب میں نے قیمتی یمنی چادریں ریا اور مروط گھسیٹتا ہوا قریبی مے فروش کی طرف جاتا تھا اور رہ رہ کر اپنی زلفوں کو چہرے سے پرے جھٹکتا تھا۔

کسی پر اس وجہ سے رشک مت کیا کرو کہ اس کے بارے کہا جانے لگے: فلاں آدمی عمر میں بڑا ہونے کی وجہ سے سردار ہو گیا ہے۔

اگر درازی عمر نے اس کو شادمان کر دیا ہے تو اس کے چہرے پر بڑھاپے کے آثار بھی تو نمایاں ہو گئے ہیں۔

سنت رسول ﷺ

خود تہبند ایک لباس ہے۔ اور اپنی جگہ نہایت عمدہ اور نفیس لباس ہے۔ خصوصاً جب کہ حضور رسالت مآب ﷺ نے خود بھی اسے زیب تن فرمایا اور وصال مبارک تک یہی آپ ﷺ کا پسندیدہ لباس رہا۔ تو سنت رسول ﷺ ہونے کے ناطے بھی اس کی فضیلت اور برکت میں کلام کی گنجائش نہیں رہتی۔ مگر اسی قدر احتیاطیں اور نزاکتیں بھی بڑی ہیں۔ کئی دیگر چیزوں کی طرح جن کا مقاصد کے خلاف استعمال جرم اور ظلم کے زمرے میں آتا ہے۔ اس کا بھی مقاصد سے ماوراء استعمال شریعت اسلامی میں ناروا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عہد جاہلیت میں ہی بعض سلیم الطبع لوگ ان

حرکات سے بیزاری و ناراضی کا برملا اظہار کرتے رہے ہیں۔

دوسرا رجحان

اس کا عین مخالف رجحان جسے حضور اکرم ﷺ نے بھی پسند فرمایا اور اسلامی تعلیمات میں خصوصی مقام اور اہمیت دی، زمانہ قبل از اسلام میں بھی موجود تھا۔ باشعور و عملیت پسند حلقے اس کو پسند کرتے، اپناتے اور سراہتے تھے۔ حضور سرکار دو عالم ﷺ نے ماضی کی بعض روایات کو ویسی ہی حالت میں یا ترمیم و اصلاح کے بعد قبول فرمایا اور شریعت اسلامی کا جزء بنایا ہے۔ معروف اصولی محمد زکریا بردیسی لکھتے ہیں:

الاترى ان الشارع الحكيم حين اشرق نور الاسلام راعى الصحيح من عرف العرب فى التشريع فاقر الكثير من الامور التى تعارفها العرب قبل الاسلام بعد ان هذبها و ادخل عليها بعض الاصلاحات. (اصول الفقہ، الدلیل السابع العرف، صفحہ ۳۳۶، دار الثقافۃ للنشر۔ القاھرۃ)

ترجمہ: کبھی آپ نے غور نہیں فرمایا؟ کہ علیم و حکیم شارع نے جب نور اسلام کو عام کیا تو عربوں کے طور طریقوں میں سے جو بھی درست تھے انہیں شریعت اسلامی میں جگہ دی ہے۔ ایسی بہت سی چیزیں ہیں جو اسلام سے قبل عربوں کے معمولات میں داخل تھیں اور آپ ﷺ نے تہذیب و اصلاح کے بعد انہیں برقرار رکھا۔

انہی طور طریقوں میں سے ایک ہمارا موضوع بحث رجحان بھی ہے۔ اس رجحان کا تاثر ہمیں ہوبکر بن ہوازن کے سردار دُرید بن صمہ کے اشعار سے ملتا ہے۔ درید کو زمانہ اسلام بھی ملا مگر ایمان سے محروم رہا۔ بہت بوڑھا ہو چکا تھا جب اس نے مسلمانوں کے خلاف جنگ حنین میں شرکت کی اور شکست کھانے کے بعد اپنی جمعیت لے کر اوطاس کے مقام پر مسلمانوں کے خلاف دوبارہ نبرد آزما ہوا۔ اب کے بار حضرت ربیعہ بن رفیع کے ہاتھوں مارا گیا۔ (دیکھئے: عامۃ کتب تواریخ و سیرت النبی، علامہ شبلی نعمانی، جلد اول، غزوہ حنین و اوطاس، صفحہ ۳۱۱، دار الاشاعت۔ کراچی ۱۹۸۵ء)

ذیل میں ہم اس کے کلام میں سے چند منتخب اشعار نقل کرتے ہیں۔ کہتا ہے:

فحفت الیہ والرماح تنوشہ
کوقع الصیاصی فی النسیج الممدد
وکنت کذات البو ریعت فاقبلت
الی جلد من مسك سقب مقدد
فان یك عبداللہ خلی مکانہ
فما کان وقافا ولا طائش الید
کمیش الازار خارج نصف ساقہ
بعید من الافات طلاع النجد
قلیل التشکی للمصیبات حافظ
من الیوم اعقاب الاحادیث فی غد

(دیوان الحماسۃ، باب المراثی، صفحہ ۲۱۲، المکتبۃ السلفیہ، لاہور)

ترجمہ:

تو جب میں اس کے پاس پہنچا تو نیزے اس کے جسم میں یوں پیوست ہو رہے تھے جیسے بنے ہوئے تیار تھان میں جولاہے کا کانٹا اترتا ہے۔

اور میری حالت بھس بھرے بچے والی اس بے تاب اونٹنی کے جیسی تھی جو پہلے تو خوف کھاتی ہے پھر اپنے لخت لخت بچے کے چمڑے سے ہی دل لگا لیتی ہے۔

تو کیا ہوا جو عبداللہ نے دنیا چھوڑ دی، وہ بزدلی کے باعث دبکا رہنے والا تو نہیں تھا اور نہ ہی اس کے وار خالی جایا کرتے تھے۔

اپنا تہمد اتنا چھوٹا رکھتا کہ آدھی پنڈلی باہر رہ جاتی، آفتوں سے دور رہتا اور پہاڑی بکرے کی طرح سنگلاخ چوٹیوں پہ کدکڑے مارتا پھرتا تھا۔

مصیبتوں کی شکایت بہت کم کرتا تھا اور آئندہ ہونے والی باتوں کے انجام کو آج ہی سے خیال میں رکھتا تھا۔

عملیت پسند حلقے فقط سراہتے ہی نہیں تھے اسے اپناتے بھی تھے اور سرگرمی اور فعالیت کا نمونہ خیال کرتے تھے۔ جس سے ناز و نعم کے پروردہ دور اور محروم ہی رہتے ہیں۔ اسلام نے بھی ایمان و عمل دونوں کو ناگزیر قرار دیا ہے۔ اور دونوں کی صحت اور سمت کی درستگی کے ضابطے بھی مقرر فرمائے اور طے کر دیے ہیں۔ مقصود مسلمانوں کو مقصدیت کی تعلیم دینا اور عملیت پسندی کی افادیت جتا کر ہمت و حوصلہ پیدا کرنا اور استقامت و سربلندی سے ہمکنار کرنا تھا۔ کسی روز اگر اس دین کے پیروکار، محض ترجمۃ الباب کی مناسبتیں ڈھونڈ ڈھونڈ کر خوش ہو جانے سے بہت آگے، ادلۂ شرعیہ کا داخلی ربط استوار اور دریافت کرنے میں کامیاب ہو گئے تو نشاۃ ثانیہ کی حقیقی بنیاد میسر آ سکے گی۔ چنانچہ ممانعت اسبال کے سرے مندرجہ ذیل حدیث مبارک اور اس طرح کے دیگر ضابطوں میں گندھی ہوئی حکمتوں اور مصلحتوں سے جڑے ہوئے ہیں:

عن ابن ابی لیلی قال کان حذیفۃ بالمدائن فاستقی فاتاہ دھقان بماء فی اناء من فضۃ فرماہ بہ وقال انی لم ارمہ الا انی نھیتہ فلم ینتہ۔ قال رسول اللہ ﷺ: الذھب والفضہ والحریر والدیباج ھی لھم فی الدنیا ولکم فی الاخرۃ۔ (صحیح بخاری، کتاب اللباس، باب لبس الحریر و افتراشہ للرجال)

ترجمہ: حضرت ابن ابی لیلی سے روایت ہے فرماتے ہیں: حضرت حذیفہ بن الیمان مدائن کے مقام پر تھے۔ آپ رضی اللہ تعالی عنہ نے پانی مانگا تو ایک کسان نے چاندی کے کٹورے میں پانی لا کر آپ کو پیش کیا۔ آپ رضی اللہ تعالی عنہ نے وہ کٹورہ اسی کو دے مارا۔ اور فرمایا: میں نے اس لیے اس کو مارا ہے کہ میں نے اسے اس حرکت سے روکا بھی تھا مگر باز نہیں آیا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: سونا و چاندی اور ریشم و دیباج دنیا میں غیر مسلموں کے لئے ہیں۔ آخرت میں تمہارے لئے ہیں۔

حکم کا تعلق تہمد سے ہے

حضور اکرم ﷺ نے بھی بصراحت تمام تہمد ہی کو ٹخنوں سے نیچا رکھنے کی ممانعت فرمائی ہے۔ جہاں جہاں یہ حکم بیان ہوا بصراحت تمام تہمد ہی کا ذکر کیا گیا۔ شلوار کا ذکر اس حوالے سے کہیں نہیں ملتا۔ چند احادیث ملاحظہ کیجئے۔

عن ابی ذر رضی اللہ عنہ عن النبی ﷺ انه قال: لا یکلمهم اللہ ولا ینظر الیهم یوم القیمة ولا یزکیهم ولهم عذاب الیم. قلت: من هم یارسول اللہ ﷺ؟ فقد خابوا و خسروا. فاعاد ها ثلاثا. قلت من هم یارسول اللہ ﷺ؟ خابوا و خسروا. قال المسبل والمنان (و) المنفق سلعته بالحلف الکاذب او الفاجر. (سنن ابی داؤد، کتاب اللباس، باب ماجاء فی اسبال الازار)

ترجمہ: حضرت ابوذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے۔ آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نبی اکرم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ ان سے کلام نہیں فرمائے گا، نہ قیامت کے روز ان پر نظر کرم فرمائے گا نہ انہیں پاکیزگی دے گا اور ان کے لئے دردناک عذاب ہے۔ میں نے عرض کیا: یا رسول اللہ ﷺ کون ہیں وہ لوگ؟ وہ تو مارے گئے اور خسارے میں رہے۔ آپ ﷺ نے تین بار یہی دہرایا اور میں بھی یہی کہتا رہا: اے اللہ کے رسول ﷺ وہ تو مارے گئے اور خسارے میں رہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: تہمد گھسیٹنے والا، احسان جتانے والا اور جھوٹی قسمیں کھا کھا کر اپنا سودا بیچنے والا۔

امام مسلم بن حجاج قشیری نے یہی حدیث مندرجہ ذیل الفاظ میں روایت فرمائی ہے:

عن ابی ذر عن النبی ﷺ قال: ثلاثة لا یکلمهم اللہ یوم القیمة المنان الذی لا یعطی شیئا الا منه والمنفق سلعته بالحلف الفاجر والمسبل ازاره. (صحیح مسلم، جلد اول، کتاب الایمان، باب غلظ تحریم اسبال الازار، صفحہ ۷۱، قدیمی کتاب خانہ۔ کراچی)

ترجمہ: حضرت ابوذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نبی اکرم ﷺ سے روایت فرماتے ہیں کہ آپ ﷺ نے

فرمایا: قیامت کے روز اللہ تعالیٰ تین آدمیوں سے کلام نہیں فرمائے گا۔ وہ آدمی جو کسی کو کچھ دیتا ہے تو احسان جتائے بغیر نہیں رہتا۔ اور وہ جو جھوٹی قسمیں کھا کھا کر اپنا مال بیچتا ہے اور وہ آدمی جو اپنا تہمد گھسیٹتا پھرتا ہے۔

عن العلاء بن عبدالرحمن عن ابیه قال سألت ابا سعید الخدری عن الازار، فقال: علی الخبیر سقطت، قال رسول اللہ ﷺ: ازرة المسلم الی نصف الساق ولا حرج اولا جناح فیما بینه وبین الکعبین وما کان اسفل من الکعبین فهو من النار، من جر ازاره بطرا لم ینظر اللہ الیه. (ابوداؤد، کتاب اللباس، باب فی قدر موضع الازار)

ترجمہ: حضرت علاء بن عبدالرحمن اپنے والد سے روایت کرتے ہیں۔ انہوں نے فرمایا: میں نے حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے تہمد کے معاملے میں دریافت کیا تو انہوں نے فرمایا: اچھے باخبر شخص کے پاس سوال لیکر آئے ہو۔ رسول اکرم ﷺ نے فرمایا ہے کہ: مسلمان کا تہمد آدھی پنڈلی تک ہے اور اس کے اور ٹخنوں کے مابین ہو تو بھی قابل مواخذہ نہیں اور جو ٹخنوں سے نیچے ہے وہ آگ ہے۔ جس نے غرور کے باعث اپنا تہمد گھسیٹا اللہ تعالیٰ اس پر نظر کرم نہیں فرمائے گا۔

عن ابی هریرة رضی اللہ تعالیٰ عنه قال بینما رجل یصلی مسبلا ازاره فقال له رسول اللہ ﷺ اذهب فتوضأ ثم جاء. فقال اذهب فتوضأ فقال له رجل یا رسول اللہ صلی اللہ علیک وسلم مالک امرته ان یتوضأ ثم سکت عنه قال انه کان یصلی وهو مسبل ازاره فان اللہ تعالیٰ لا یقبل صلوة رجل مسبل. (سنن ابی داؤد، کتاب اللباس، باب ماجاء فی اسبال الازار)

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت کرتے ہیں کہ ہمارے سامنے ایک آدمی اپنے تہمد کو زمین تک لٹکائے نماز پڑھ رہا تھا۔ رسول اکرم ﷺ نے اسے حکم دیا: جاؤ اور وضو کرو۔ وہ جب واپس آیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: جاؤ اور وضو کرو۔ ایک آدمی نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ معاملہ کیا ہے؟ آپ ﷺ نے اس کو حکم دیا کہ جائے اور وضو کرے، پھر آپ نے خاموشی اختیار فرمائی۔ آپ

ﷺ نے فرمایا: وہ اس حالت میں نماز پڑھ رہا تھا کہ اس کا تہبند زمین تک لٹکا ہوا تھا۔ اور اللہ تعالیٰ اس شخص کی نماز قبول ہی نہیں فرماتا جو تہبند لٹکائے ہوئے ہو۔

اسبال کے مواقع

اب یہ بھی دیکھنا چاہیے کہ اسبال کہاں کہاں ہوتا ہے یا ہوسکتا ہے؟ فرمان رسالت مآب ﷺ ہے: عن سالم بن عبداللہ رضی اللہ عنہما عن ابیہ عن النبی ﷺ قال: الاسبال فی الازار و القمیص والعمامۃ ومن جر منہا شیئاً خیلاء لم ینظر اللہ الیہ یوم القیمۃ. (سنن ابی داؤد، کتاب اللباس، باب فی قدر موضع الازار)

ترجمہ: حضرت سالم بن عبداللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنے والد ماجد سے اور وہ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: اسبال تہبند، قمیص اور عمامے میں ہوتا ہے۔ اور جو کوئی ان میں سے کوئی بھی چیز ازراہِ تکبر گھسیٹتا پھرے گا، قیامت کے روز اللہ تعالیٰ اس پر نظر کرم ہی نہ فرمائے گا۔

اس حدیث پاک میں حضور اکرم ﷺ نے واضح لفظوں میں یہ تعین بھی فرما دیا ہے کہ اسبال کہاں کہاں ہوتا ہے یا ہوسکتا ہے۔ آپ ﷺ نے بالترتیب تہبند، قمیص اور عمامے کا ذکر فرمایا ہے۔ اس میں ایک اشارہ یہ بھی ہے کہ سب سے زیادہ امکان تہبند میں ہے۔ قمیص میں اس سے کم اور عمامے میں یہ امکان اور کم ہے۔ یہ پہلو غور طلب ہے کہ شارع علیہ السلام نے مواضع اسبال کا تعین بھی خود فرما دیا۔ اور شلوار یا پاجامے کا ذکر نہیں فرمایا۔ آپ ﷺ کا یہ سکوت معرض بیان میں ہے۔ مسلمہ امر اور قاعدہ کلیہ ہے: لا ینسب الی ساکت قول لکن السکوت فی معرض الحاجۃ بیان . (مجلۃ الاحکام العدلیہ، مادہ: ۶۷)

ترجمہ: کسی خاموش کی طرف کوئی قول تو منسوب نہیں کیا جاسکتا البتہ جہاں ضرورت ہو، خاموشی بھی بیان شمار ہوگی۔

معرض بیان میں شارع علیہ السلام کی خاموشی کے حوالے سے فخر الاسلام علامہ بزدوی فرماتے ہیں: السکوت من صاحب الشرع ﷺ عند امر یعاینہ عن

التغییر یدل علی الحقیقۃ علیہ و یدل فی موضع الحاجۃ الی البیان علی البیان. (کنز الوصول الی معرفۃ الاصول معروف بہ اصول بزدوی، باب بیان الضرورۃ، صفحہ ۲۱۷، میر محمد کتب خانہ۔ کراچی)

ترجمہ: کسی امر کو ملاحظہ فرما کر بھی تبدیلی کا حکم دینے کی بجائے آپ ﷺ کی خاموشی کا مطلب یہ ہے کہ وہی حقیقت ہے۔ اور جہاں بولنے کی ضرورت ہو، خاموشی بھی بیان ہوتی ہے۔

فخر الاسلام علامہ بزدوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے ہی ایک اور جگہ قرآن مجید کی آیت مبارکہ "یا یہا الذین امنوا لا تسئلو عن اشیاء ان تبدلکم تسؤکم (سورہ المائدہ، آیت ۱۰۱) اے ایمان والو! مت پوچھا کرو ایسی باتیں کہ اگر تم پر ظاہر کردی جائیں تو تمہیں بری لگیں" کے ذیل میں حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا قول نقل کیا ہے:

ابہموا ما ابہم اللہ واتبعوا ما بین اللہ

(اصول بزدوی، باب وجوہ الوقوف علی احکام النظم، صفحہ ۱۳۳، میر محمد کتب خانہ۔ کراچی)

ترجمہ: جسے اللہ نے مبہم چھوڑ دیا اسے مت کریدو اور جسے بیان کر دیا ہے اس کی اتباع کرتے رہو۔

جبکہ پیر کرم شاہ الازہری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے بھی محولہ بالا آیت مبارکہ کی تفسیر فرماتے ہوئے ایک قدرے طویل حدیث نقل فرمائی ہے، جس کے آخری کلمات یہ ہیں: وسکت عن اشیاء من غیر نسیان فلا تبحثوا عنہا. (ضیاء القرآن، تفسیر آیت محولہ بالا)

ترجمہ: شارع نے بعض چیزوں کے معاملے میں بھولے بغیر خاموشی اختیار فرمائی ہے تو تم انہیں مت کریدو!

اب حدیث "مواقع اسبال" کے مضمون پر ایک مرتبہ پھر غور فرمائیے۔ پاجامے یا شلوار کے لئے عین معرض بیان ہے۔ قمیص اور عمامے تک کا تو آپ ﷺ نے ذکر فرما دیا مگر شلوار یا پاجامے کو چھوڑ دیا۔

اب ان میں کمی بیشی کی کسی اور میں ہمت و مجال نہیں ہونی چاہیے۔ ورنہ یہ شارع علیہ الصلوٰۃ والسلام کے مقابلے میں (عیاذاً باللہ) جرأت ہوگی۔ یا تو کوئی صاحب ایمان یہ کہنے کی

ناپاک جسارت کرے کہ ان تین اشیاء کا ذکر فرماتے وقت آپ کو پاجامہ یعنی شلوار، جو باقی ہر ہر جگہ یاد رہا، یاد نہیں رہا تھا۔ اور ہمیں چونکہ یاد رہا اس لئے پائچے اونچا رکھنے کا علم ہم نے اپنی طرف سے شریعت میں داخل کرتے ہوئے شریعت کا ادھورا پن دور کیا۔ ورنہ یہ تسلیم کئے بغیر چارہ نہیں رہے گا کہ یہ ایک سنگین غلطی ہے۔ شریعت کی آڑ میں جبری مشقت ہے۔ اور بھولے بھالے لوگوں کو ان کی کم علمی کی سزا کے طور پر جبراً جہنمی اور گناہگار بنایا جا رہا ہے۔ (باقی آئندہ)

اعجاز ہے کسی کا یا گردش زمانہ!
ٹوٹا ہے ایشیا میں سحر فرنگیانہ!
تعمیر آشیاں سے میں نے یہ راز پایا
اہل نوا کے حق میں بجلی ہے آشیانہ!
یہ بندگی خدائی، یہ بندگی گدائی
یا بندۂ خدا بن، یا بندۂ زمانہ
غافل نہ ہو خودی سے، کر اپنی پاسبانی
شاید کسی حرم کا تو بھی ہے آستانہ!
اے لاالہ کے وارث باقی نہیں ہے تجھ میں
گفتار دلبرانہ، کردار قاہرانہ
تیری نگاہ سے دل سینوں میں کانپتے تھے!
کھو گیا ہے تیرا جذب قلندرانہ!
راز حرم سے شاید اقبال باخبر ہے
ہیں اس کی گفتگو کے انداز محرمانہ!

روح اجتماع اور جذبۂ تعاون

علامہ شاہ محمد جعفر ندوی پھلواری

سبق آموز تمثیلی حکایت

بچوں کی کتاب میں یہ حکایت آپ نے پڑھی ہوگی کہ: کسی گاؤں میں آگ لگ گئی۔ لوگوں نے اسے بجھانے کی بڑی کوشش کی لیکن آگ بڑھتی ہی گئی۔ آخر سب کو اسی میں خیر نظر آئی کہ بستی چھوڑ کر جلد سے جلد بھاگ جائیں۔ پہلے عورتوں اور بچوں کو روانہ کیا پھر جو ضروری اثاثہ اس عجلت میں لے جا سکتے تھے لے گئے۔ اس افراتفری میں دو شخص رہ گئے۔ ایک نابینا تھا اور دوسرا لنجا۔ نابینا راستہ نہیں دیکھ سکتا تھا اور لنجا چل نہیں سکتا تھا۔ ایک آنکھوں سے معذور تھا اور دوسرا پیروں سے۔ ساری بستی اپنی جان بچانے کے لیے بھاگ گئی۔ لیکن یہ دونوں معذور و مجبور فریاد کرتے رہ گئے۔ جب اپنی جان خطرہ میں ہو تو دوسروں کو بچانے کی فکر کون کرتا ہے؟ آگ برابر بڑھتی جا رہی تھی اور قریب تھا کہ دونوں معذور بھی اس کی لپیٹ میں آجائیں۔ یکایک نابینا کو ایک ترکیب سوجھی وہ ٹٹولتا ہوا لنجے کے پاس آیا اور اس سے کہا کہ تم میری پیٹھ پر سوار ہو جاؤ۔ نابینا بیٹھ گیا اور لنجے کو سہارا دے کر اپنے کاندھوں پر سوار کر لیا اور لٹھیا کے سہارے کھڑا ہو گیا اور لنجے سے کہا کہ اب تم رستہ بتاتے جاؤ اس طرح دونوں صحیح سلامت بستی سے باہر آگئے اور آگ کی لپٹ سے محفوظ ہو گئے۔ رومی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے کیا مزے کی بات کہی ہے۔

اے برادر قصہ چوں پیمانہ ایست — معنی اندروے مثال دانہ ایست